نگار

قیمت ۸ر

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	فہرست مضامین اگست سنہ ۳۵ء	شمارہ ۲

ملاحظات ——— ۲

پارسی اہلِ کتاب ہیں ——— محمد طاہر رضوی ام۔اے ——— ۹

جھانسی کی رانی ——— ۲۰

مسئلہ آبادی اور ہندوستان ——— عبدالرحیم شبلی بی۔اے ——— ۳۲

بچہ ——— سید محمد احسن بی اے۔ حیدرآبادی ——— ۴۱

سوا سو سال قبل دکن کی شاعری ——— سید تمکین کاظمی ——— ۴۶

انقلاب کا اثر روسی زبان پر ——— ڈاکٹر محمد نصیر الدین ——— ۵۶

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق ——— ۶۰

باب المراسلۃ والمناظرہ ——— ۶۵

باب الاستفسار ——— ۷۰

مطبوعات موصولہ ——— ۷۴

منظومات ——— نظرت۔ کیفی ——— ۷۸-۸۰

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	اگست ۱۹۵۳ء	شمارہ ۲

ملاحظات

افسانۂ روح و روحانیت

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں کہ بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے، اور ہر عقیدہ کیلئے وہ کوئی نہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے، لیکن اگر اُن دلایل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ کمزور دلیل وہ ہے جو بقاءِ روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سنیں یہ معلوم کر لینا مناسب ہے کہ بقاءِ روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں۔

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقا ہے، یعنی انسان میں جس چیز کو احساسِ تشخص، حافظہ اور تاثر سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہیگا۔ دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں وہ بقاءِ روح کے ساتھ حشرِ اجساد کے بھی قایل ہیں، یعنی ایک دن ایسا آئے گا جب جسموں سے جدا ہو جانے والی

روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے۔

حیات بعد الموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوع انسانی ــــ اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی، تو وہ اپنے مردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور اُن کو اپنے پسماندگان کے ساتھ وہی تعلق باقی ہے جو ان کی زندگی میں پایا جاتا تھا اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ روح اور جسم دو بالکل علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں اور جب روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو اس کی ہستی کسی نہ کسی طرح قائم رہتی ہے چنانچہ اسی بنار پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھدی جاتی تھیں تاکہ اس کو حیات بعد الموت کے طویل سفر میں تشنگی و گرسنگی کی تکلیف نہ پہونچے۔ (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی عہد وحشت اور اسی اعتقاد جاہلانہ کی یادگار ہیں)

خیر، اگر عہد قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھتا تھا تو جائے حیرت نہیں کیونکہ وہ غریب حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا، لیکن اب کہ آغاز حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہو گیا ہے روح کے بقا کا قایل ہونا سخت حیرتناک امر ہے۔

حیات حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد صرف ایک خلیہ یا کویاد (Cell) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو[1] اس پیوند کے بعد بیشمار خلایا بنتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور ایک وقت معینہ کے بعد وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ پھر حیات دنیاوی میں بھی بیشمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے ماتحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجودِ حیات نہیں پایا جا سکتا یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیات حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے، لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیہ سے ملے بغیر ظاہر ہو سکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب در ارب (بلکہ بیشمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کا پیوند ہو کر حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بیکار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر نتیجہ خیز

---

[1] نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پا کر اور اپنے اندر سے کثیر خلایا پیدا کرکے، نشو و نما کا باعث ہوتا ہے۔

خلایا میں پائی جاتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فایدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کیجائے۔

اگر وہ چیز جس کا نام "روح" ہے جسم سے بالکل علحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیونکر جسم کے اندر آگئی۔ جب انسانی وجود عبارت ہے دو بے روح خلایا کے اتصال سے، تو پھر روح انھیں کہاں سے آگئی۔ اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک جنین جس نے رحم مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑگئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بیجان پیدا ہوا، لیکن بجلی اور دیگر آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کر آئی اور وہ اپنی طبیعی زندگی پوری کرکے مرا، اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بیجان ہوگیا۔ لیکن اس میں تنفس دوبارہ پیدا کردیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علحدہ کوئی دوسری چیز ہے، تو بتایا جائے کہ اس مُردہ جنین اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لئے روح کہاں چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کررہی تھی جو کو اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محض حیات کا وجود، وجود روح کے لئے ضروری نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہم جسم انسانی میں حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے، کیونکہ دیگر ذیحیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور اُن میں نہیں۔ ایک درخت میں "حیات" ہے لیکن روح نہیں، ایک جانور میں "زندگی" ہے لیکن روح نہیں۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے اس کی انتہا بھی ہونی چاہئے۔ لیکن انسان کا حافظہ، اور ادراک نفس مرنے کے بعد بھی قایم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعوی کس حد تک درست ہے۔ انسان میں وجود روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کیجاسکتی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذویحیات اشیاء میں بھی ادراک وحافظہ نہ پایا جائے، گھوڑے، کتے اور بلی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوت حافظہ بھی پائی جاتی ہے اور ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ادراک وحافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اسوقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں جب وہ رحم مادر میں تھا، یا جب دنیا میں آنے کے بعد اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا تھا، اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ وادراک بھی محو ہوجاسئے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہوجائے گی، نہ پہلے کچھ تھا، نہ بعد کو کچھ ہوگا۔

عہد قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کے اور مخلوقات کا اسے علم تھا، اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیونکہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں، آسمان سے اوپر بہشت ہے جہاں سے فرشتے اوپر سے نیچے آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دوربینوں نے کرۂ زمین سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرام سماوی ہمارے سامنے پیش کر دئے ہیں۔ ہمارے لئے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لامتناہی فضائے ان بیشمار دنیاؤں میں، صرف کرۂ ارض ہی کے باشندوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے اور انھیں کی روحوں کو بقاء دوام کے خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ پھر اور کروں کو جانے دیجئے، خود اسی زمین کے اور تمام مخلوقات کو لیجئے۔ کیا وجہ ہے کہ انسان کی روح کو بقا حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دی جائیں، اور اگر اس کا جواب صرف مصلحت خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضاء الٰہی و مصلحت ربانی روح انسانی کو فنا نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے سے اُسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں رہتی ہے بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لیجاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالم برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں؟ روح کا یہ سفر کس ذریعہ سے ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہونچنے کے بعد وہ کہاں اور کیونکر رہتی ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوگی، گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا جمگھٹا ہوگا اور وہ اسی دنیا کی طرح آپس میں تبادلۂ خیال کر سکیں گے، اب اسی اعتقاد کے ساتھ ان علمی حقایق کو بھی سامنے رکھئے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کر رہی ہے اور ۲۴ گھنٹہ میں پوری ایک گردش کر لیتی ہے یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً ۹ کرور ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے۔ پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظام شمسی کی ہے جو قطب کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظام قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے نظامہائے شمسی کے ساتھ فضاء کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرۂ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہو کر باہم گر ملنا یا کسی ایک جگہ قرار پانا باور کیا جا سکتا ہے۔

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن مع اپنے جسم کے اُٹھایا جائیگا۔ اب سے دو ہزار سال قبل اہل فلسطین جب وہ نہ زمین کی حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے، یقین کرتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دنیا کو بسے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے

اور جلد ہی اس کو پھر تباہ ہو جاتا ہے۔ لیکن آج یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ انسان کا وجود کرۂ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے کم از کم تین چار تو صرف برفیلے دور ایسے آچکے ہیں جنھوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبو کر رکھدیا یا زمین کے اندر دفن کر کے ختم کر دیا۔ خدا جانے کتنی بار نوع انسانی جانوروں کی غذا بنکر ختم ہوئی اور پھر انھیں سے پیدا ہوئی۔ الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گزشتہ انسانوں، اور جانوروں کے اجزا شامل ہیں اس لئے اگر حشر اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کونسا کیمیائی طریقہ ہوگا جو لکھو کھا سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزا کو پھر فراہم کر سکے گا اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزا فراہم کر کے میرا اصلی جسم طیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی ہیولی میں نشو و نما، بیماری، ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈالدیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟ ایک حصہ اس کا دھواں بنکر غائب ہو جاتا ہے، ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہو کر آپ کے کمرہ کو گرم کرتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بنجاتا ہے۔ بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے۔ فطرت ہر وقت جوڑنے، توڑنے، ملانے اور منتشر کرنے میں مصروف ہے اور قوت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی صورتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے، اس عمل سے بچ رہے اگر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے، تو ایک چیونٹی بھی یہی دعویٰ کر سکتی ہے، ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ روح ہم میں بھی ہے اور اُن میں بھی اور اگر ہماری روح کو بقا ہے تو اُن کی روحوں کو بھی ہونا چاہئے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے۔ فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قائم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تُلی ہوئی ہے، جب تک ان دونوں میں توازن قائم ہے، ہم صحیح و توانا کہلاتے ہیں، لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہو جاتے ہیں، اور جب اس کا بالکل تصرف ہو جاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں، لیکن ہماری قوت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے، اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے، خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات، و حیوانات کی۔ اس لئے اب پھر ہمارے انھیں اجزاء کا فراہم ہو کر یکجا ہونا اور اصلی صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقاء روح کا عقیدہ صرف جذبۂ محبت کی بناء پر پیدا ہوا ہے جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہونچانا بھی تھا، اول اول جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ، اس کے بچے، اس کے بھائی بہن اسکے سردار و بزرگ دفعتہً مرجاتے ہیں تو اسے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ یہ واقعی ہمیشہ کیلئے

فنا ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد اس نے انھیں خواب میں بھی دیکھا، خواب میں ان سے باتیں بھی کیں اور اس سے اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے وہی تعلق محبت کا رکھتی ہیں۔ پھر یہ عقیدہ برابر اسوقت تک قائم رہا جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انھیں قوموں میں باقی ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کیا فی الحقیقت انھیں اسکا یقین بھی ہے۔ ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں لیکن مجھے اس میں کلام ہے ۔۔ اس سے قبل نگار کے صفحات پر میں عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقاید جن کا تعلق ما بعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات وقیاسات ہیں، حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ علم حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک سے ہے یا اُن تجربات سے جو بربنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں ۔۔۔ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجئے۔ وہ لوگ جو حیات بعد الموت کے قایل ہیں اور حقیقی سکون و آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں، اُن سے پوچھئے کہ باوجود اس علم کے کہ دنیا کی زندگی ناپایدار و متکلف ہے اور اُخروی زندگی ابدی راحت، وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں، جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج کرتے ہیں، تپ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انھیں موت کا یقین ہوتا ہے لیکن پھر بھی چارہ و علاج ضرور کرتے ہیں ۔۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں اُخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے، یقین نہیں اگر انھیں یقین ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہونچنے کی کوشش کرتے جہاں بہشت کی راحتیں ہیں، حوروں کی آغوشیں ہیں، بچھڑے ہوئے احباب ہیں، چھوٹے ہوئے اعزہ ہیں، جدا ہو جانے والی اولادیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملیگی، میں کہتا ہوں کہ اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جسے یقین سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اگر واقعی سزا کا یقین ہو تو قیامت تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا ورنہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقار روح کے قایل ہیں وہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے اُن روحانئین کے بیان کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہمکلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں، اور آیندہ ماہ کی اشاعت میں بالتفصیل بیان کریں گے کہ ان مدعیان روح و روحانیت نے کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں سے نامہ و پیام کرنا کہا جاتا ہے وہ کتنا بڑا مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلہ روح یا حیات بعد الموت منجملہ اُن چند مسایل کے ہے جو صرف انسانی تمنا کی پیداوار ہیں اور اُن عقاید سے متعلق ہیں جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کیجا سکتی بلکہ جو سراسر اصول فطرت و نظام عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذاہب عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعد الموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قایم رہ سکیں، کیونکہ جوں جوں مادی و علمی ترقی بڑھتی جا رہی ہے انسان میں خوداعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں، لیکن اگر مذاہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درس اخلاق سے بھی ہے جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیات تمدن کو پورا کرنے والا ہے، تو ان کے لئے لازم ہے کہ وہ صرف اسی پر اپنی بنیاد قایم کریں اور اُن عقاید پر زور نہ دیں جو ان کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے، اس لئے مذاہب عالم کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ڈماکریسی و مشینری کی ترقی کے ساتھ ایک دن اس کو بالکل ختم ہو جانا ہے، کیونکہ اسوقت تک سب سے زیادہ دشمنی مذہب کے ساتھ انھیں دو چیزوں نے کی ہے اور ان کی ترقی کا کھلا ہوا نتیجہ مذاہب کا زوال ہے۔

مجموعۂ استفسار و جواب

اس کی ایک جلد سال گزشتہ شایع ہو چکی ہے۔ باقی حصہ کو دو جلدوں میں شایع کرنے کا خیال تھا، لیکن بعد کو میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ہی جلد میں اس کو ختم کر دیا جائے، چنانچہ کام شروع کر دیا گیا اور ایک چوتھائی حصہ کتاب کا چھپ بھی گیا ہے — اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں قیمت چار روپیہ سے کسی طرح کم نہ ہوگی اور ممکن ہے کہ بیک وقت اتنی رقم دینا ناظرین نگار کو دشوار ہو جائے اس لئے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ قارئین کرام باقی حصہ کو دو روپیہ فی جلد کے حساب سے دو جلدوں میں لینا چاہتے ہیں یا چار روپیہ کے حساب سے ایک ہی جلد میں۔

منیجر نگار

پارسی اہل کتاب ہیں

حضرت زرتشت پیغمبر برحق اور نبی مرسل تھے

(مسلسل)

علمائے مغرب نے اکثر و بیشتر اپنی کتابوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زرتشت نے کسی نئے دین یا نئے اُصول کی تعلیم نہیں دی اور زرتشتی عقیدہ کے مطابق بدی کی قوت خداوند عالم کے مدمقابل یا خدا کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتی ہے[1]۔ پروفیسر خارنل لکھتے ہیں :۔ "ہمیں کسی جگہ سے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا ہے کہ زرتشتی گروہ نے کسی وقت بھی اہرمن کا کسی صورت میں احترام کیا ہو بلکہ مزدا پرستوں کے نزدیک اہرمن کی مخالفت اُصول مذہب میں داخل ہے[2]"

اسی طرح کتاب "تعالیم زرتشت" میں مرقوم ہے کہ بدی کی قوت[3] (اہرمن) حقیقت میں انسانی فطرت کے اُس رُخ کو کہتے ہیں جس سے خباثت اور بُرائی و بدکاری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا وجود بالذاتہ مطلقاً نہیں ہے۔

کیا مسلمانوں کا عقیدہ بھی فرشتوں اور شیاطین کے متعلق بالکل اسی قسم کا نہیں ہے[4]۔

کسقدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عیسائی باوجود اپنی تثلیث کے اہل کتاب باقی رہیں اور رکھے جائیں[5] مگر زرتشتی خدا کی توحید پر ایمان رکھتے ہوئے بھی محض اسی بنا پر کافر کہلائیں کہ اُن کے پیغمبر یا اُن کی الہامی کتاب کے متعلق کوئی قطعی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ ہمارے ناظرین کو شاید یہ گمان ہوسکتا ہے کہ عیسائیوں کی جماعت بعد کے زمانہ میں تثلیث کی قایل ہوئی اور اُن کا عقیدہ حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت یا ابنیت کے متعلق حضرت محمد عربی صلعم کے

---

[1] تاریخ قدیم (کیمبرج برِیز) جلد اول صفحہ ۲۰۸ - [2] اوصاف خداوندی ص۱۶۳ - [3] دینیات زرتشتی (مولفۂ دہالا) صفحہ ۳۰۴- [4] موعظۂ اسلام (مولفۂ ارنلڈ) صفحہ ۲۰۸ - اسلام و دین زرتشت (مولفۂ خواجہ کمال الدین) صفحہ ۸۸- [5] تفصیلی بحث کے لئے "تثلیث کی اصلیت" (مطبوعہ کرسچین لائف پبلشنگ کمپنی لندن ۱۸۸۳ء) ملاحظہ فرمائیے۔

زمانۂ نبوت میں نہ تھا لہٰذا اس سلسلہ میں مناسب ہو گا کہ ہم خود قرآن سے اس بات کو ثابت کر دیں کہ عیسائی جیسے اسوقت ہیں ویسے ہی اُسوقت بھی تھے اور قرآن مجید نے صاف صاف کھلے الفاظ میں باوجود اُن کے عقیدۂ باطل کے اُنھیں اہلِ کتاب کہکر مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے اہلِ کتاب تمھیں چاہیے کہ اپنے مذہب کی حد سے باہر قدم نہ رکھو اور خدا کے خلاف کچھ نہ کہو بلکہ سچ بولو۔ مسیح ابن مریم تو خدا کے صرف رسول ہیں اور روح اللہ جو بحکم خدا مریم کے اندر داخل کی گئی تھی پس تم خدا اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا ذکر چھوڑ دو کہ اسی میں تمھاری بہتری ہے۔ خدا تو بس ایک ہی ہے۔ اُس کی شان سے بعید ہے کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو۔ جو کچھ دنیا میں ہے سب کچھ اُسی کا ہے اور وہی تمھارا سب سے بڑا محافظ ہے"

(سورۂ ۴۔ آیۃ ۱۶۹)

بہر طور اب ضروری ہے کہ ہم اپنے اصلِ بحث کی طرف پھر رجوع کریں۔ پیغمبر ایران کو یقین کامل تھا کہ نیکی کو انجام کار بدی پر غلبہ حاصل ہوگا ورنہ خدا کے انصاف میں فرق آجائے گا۔ اسی طرح زرتشت کا عقیدہ تھا کہ ہماری آیندہ زندگی یعنی حیات بعد الموت ایک ایسا عالم ہو گا جہاں خدا اپنے نیک بندوں کو اُنکے اعمال کی جزا اور بروں کو اُن کے افعال کی سزا دیکر اپنے عدل وانصاف کا بہترین مظاہرہ فرمائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی ہی تعلیم کا نتیجہ تھا جو آج بھی زرتشت کے ماننے والے خدا کے آخری انصاف کو مدِّ نظر رکھکر نیکی کی زندگی بسر کرنے کی کوشش میں مصروف اور بُری راہ سے محفوظ رہنے کی سعی کرتے ہیں[۱]۔

دیگر الہامی مذاہب کی طرح زرتشتی بھی فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں[۲]۔ اگرچہ اس سلسلہ میں اُن کا اعتقاد غلو کی حد تک پہونچ گیا ہے۔ ہم ڈاکٹر مولٹن ایک مغربی عالم کا خیال اس خصوص میں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں ہے[۳]۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"مذہب اوستا میں توحید کے متعلق جو کچھ عقیدہ ہے وہ ایک حد تک عیسائیوں کے خیال سے ملتا جلتا نظر آتا ہے یعنی "رومن کیتھلک" اور "گریک ارتھوڈوکس" فرقے بھی پارسیوں جیسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ توحید اگرچہ اپنی جگہ پر قائم ہے مگر خدا کے ماتحت فرشتوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے گئے جن سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اُمورِ خداوندی میں ملائکہ کی بھی شرکت ہے، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں بلکہ جس طرح ہم لوگ دنیا دی

---

[۱] اسلام اور توحید مولفۂ خواجہ غلام حسین مطبوعہ حیدرآباد ملاحظہ ہو۔ [۲] ینا۔ باب ۳۰۔ آیۃ ۹ باب ۱۳۱۔ آیۃ ۴۔ اسکے ساتھ ہی مشہور جرمن مستشرق الگزنڈر کوہٹ کی معرکۃ الآرا تصنیف "فرشتوں اور شیطانوں کا مسئلہ مذہب یہود میں" جہاں وہ اس عقیدہ پر پارسی خیال کی روشنی میں تفصیلی بحث کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔ [۳] گنجینۂ معاں صفحہ ۱۰۰۔

معاملوں میں حکومتِ اعلیٰ کو براہ راست مخاطب نہ کرکے ماتحت حکام سے چارہ جوئی کرتے ہیں اُسی طرح پارسی بھی (مثلاً) جب عقل و فراست کا خواستگار ہوتا ہے تو فرشتۂ ہوما کا نام لیتا اور فتح و ظفر کے سلسلہ میں وریرتھا گوما کو یاد کرتا ہے درانحالیکہ اُس کا اصلی مخاطب اہورامزدا ہی کی ذات ہوتی ہے اور ان ملائکہ کو وہ محض ذریعہ اور واسطہ سمجھتا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ پارسیوں کی مذہبی تاریخ طرح طرح کے انقلابات کا شکار رہی ہے - اور اس بنا پر مذکورۂ بالا بدعقیدگی کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں - یونانیوں نے جسوقت ایران فتح کیا پائے تختِ استخر کی تباہی کے ساتھ جیسا کہ قبل میں ذکر کیا جا چکا ہے زرتشتی ادبیات بھی کلیتہً برباد ہوئیں اور صدیوں بعد تک بزمانۂ تسلطِ یونانی ایرانیوں کا مذہب سخت خطرہ میں رہا۔[1] عوام کے مذہبی معلومات کا دار مدار محض علمائے مجوس کی ذات پر منحصر تھا جنھوں نے صرف اپنی یادداشت سے کام لیکر ساسانیوں کے زمانہ میں اپنی دینی کتابیں کسیقدر ترتیب دیں۔ ظاہر ہے کہ اصل اور نقل میں زمانہ کے ردوبدل اور خیالات کے اختلاف کی بنا پر کسقدر فرق پیدا ہوسکتا ہے چنانچہ غیر شرعی رسومات اور عقاید کی بنیاد در اصل ساسانیوں کے زمانہ میں پڑی اور آج خود بہتیرے پارسی حضرات انکو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں[2] پھر بھی باوجود اس کے کہ پارسی آگ کے احترام میں مبالغہ کو راہ دیتے ہیں۔ آفتاب کے رُخ کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں۔ اور خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے فرشتوں کا توسط ڈھونڈتے ہیں تاہم اُن کے ارکانِ دین اور اُصولِ مذہب میں ان ہزاروں سال کے بعد بھی کسی طرح کا فرق نظر نہیں آئے گا۔ اپنی شریعت کے آج بھی وہ پابند اور پاکبازی و نیک عملی کے اسوقت بھی وہ قایل ہیں۔ زرتشت کے تین مشہور اُصول نیک خیال - نیک اقوال اور نیک افعال - کی پیروی آج بھی اُن کی جماعت مستعدی سے کررہی ہے[3]۔ اور پروفیسر مولٹن کے قول کے مطابق حقیقت میں یہ نتیجہ ہے اوستا کی اُس تعلیم کا کہ ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق انجام کار جزا و سزا پائے گا۔ اگر نیک اعمال کا پلہ بھاری ہوگا تو انعام کا مستحق سمجھا جائے گا اور بُرے کاموں کی سزا بھگتنی پڑے گی[4]۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صداقت - ایمانداری - پاکبازی - اخلاص - دریادلی - اور غربا پروری و ہمدردی میں اس مخصوص قوم کو دیگر اقوامِ عالم پر عجب طرح کی فوقیت حاصل رہی ہے اُن کی ایک مذہبی کتاب میں مرقوم ہے کہ وہی شخص متقی کہا جاسکتا ہے جو اپنے دنیاوی کاروبار میں نہ محض یہ کہ سچا اور ایماندارانہ رویہ اختیار کرتا ہے بلکہ محتاجوں

---

[1] رالنسن مشہور انگریز مورخ کی تصنیف "ساتویں عظیم الشان سلطنت" صفحہ ۵۸ - ۵۵ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی دیار تھی) دورِ حکومت کے اختتام پر کس طرح شاپور اردشیر بانی خاندان ساسانی نے مجوسی علماء کے ذریعہ مذہبی کتابوں کی تدوین کی جو اسوقت تقریباً ناپید ہوچکی تھیں۔ [2] گنجینۂ مغاں (مولفہ مولٹن) اور دینیاتِ زرتشتی (مولفہ دہالا) - [3] تصنیفات ڈاکٹر دہالا - پروفیسر جیکسن اور ڈاکٹر مولٹن ملاحظہ فرمایئے - [4] گنجینۂ مغاں صفحہ ۱۷۹ -

پر روپیہ خرچ کرتا اور اپنے عزیز و اقارب سے نیک برتاؤ لازم جانتا ہے۔ محنت و مشقت کرتا اور اپنے گھر کو آتش اور مویشی سے رونق دیتا ہے۔ اسی طرح کیشِ زرتشتی عورتوں کے لئے عصمتِ نفس اور اطاعت شوہر اُنکا بہترین وصف قرار دیتا اور مردوں کو عورتوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس تعلیم کا نتیجہ بھی ظاہر ہے کہ آج پارسی قوم کے زن و مرد باوجود اس کے کہ زمانہ اس قدر ترقی کر چکا ہے خوش و خرم زندگی بسر کرتے اور خانگی جھگڑوں سے ایک حد تک بچے رہتے ہیں۔ بداطواری اور طلاق اس جماعت میں مفقود ہیں۔ لارڈ ایمپتھل نے (جو کسی زمانہ میں مدراس کے گورنر تھے) ایک بار فرمایا تھا کہ "وہ پارسیوں کے اندر اُن کے آبا و اجداد کے مفتخر جذبات کی پابندی ایک حد تک کامیابی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے ابتک مکروہ پیشوں کے اختیار کرنے سے اپنے تئیں بچائے رکھا ہے۔ یہ اُنھیں کی زندگی کا عدیم المثال واقعہ ہے کہ اُن کی جماعت کی کسی عورت نے آج تک "کسب" سے روزی حاصل نہیں کی"[1]۔ اسی طرح دائرۃ المعارف دین و اخلاق میں ایک مغربی عالم یوں رقمطراز ہے[2]: "یہ فخر امتیاز پارسیوں ہی کو حاصل ہے کہ اُن کی عورتوں میں مشکل سے کوئی ایسی ملیگی جو آوارگی اور بدچلنی کی شکار ہوئی ہو۔"

خواجہ کمال الدین مرحوم نے خوب فرمایا ہے کہ پارسیوں کا شمار اُن برگزیدہ اقوام میں کیا جاسکتا ہے جن کے پیشِ نظر زندگی کے عمدہ اور پسندیدہ اُصول ہوں[3]۔ اور بلاشبہ حضرت زرتشت کے تعلیمات کا باوجود اسقدر عرصۂ دراز گزر جانے اور زمانہ میں گوناگوں انقلاب ہوجانے کے اپنی اصلی حالت میں نہ محض اُصولاً بلکہ عملاً بھی قائم اور باقی رہجانا ہی اُن کی بزرگی اور بلند نظری کی بہت بڑی دلیل ہے۔ آج ہمدردیِ بنی نوعِ انسان کے سلسلہ میں پارسیوں کا مقابلہ کون کرسکتا ہے جو اپنے لاکھوں روپئے ہر سال محض خیرات خانوں۔ مدرسوں۔ یتیم خانوں۔ شفاخانوں اور مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بے دریغ خرچ کرتے اور عوام الناس کو بلا امتیازِ مذہب و ملت آرام و آسائش پہونچاتے ہیں۔

اپنے اصل موضوع سے الگ ہوکر ہم ذرا دوسری طرف متوجہ ہوتے اور ناظرین کی دلچسپی کے لئے تاریخ عالم کے ایک اہم باب سے بحث کرتے ہیں۔ دارائے اعظم شاہنشاہ ایران قدیم کے متعلق اکثر و بیشتر مورخین کا خیال ہے کہ اُس نے زرتشت کی وفات کے بعد مذہب کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس دارائے اعظم کا ذکر قرآن مجید اور دیگر صحفِ آسمانی میں بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن میں

---

[1] لارڈ موصوف نے اپنی ایک تقریر میں بمقام لندن مارچ ۱۹۰۸ء میں اس خیال کا اظہار فرمایا تھا اور جسے مسٹر مانکجی کوپر نے اپنی کتاب "جلم در دین زرتشت" میں نقل کیا ہے۔ [2] جلد نہم صفحہ ۴۴۰۔ [3] اسلام در دین زرتشت صفحہ ۱۱۔

ذوالقرنین (دو سینگ والے) کا ذکر آتا ہے[1]۔ کہ خدا نے اُنھیں ہر چیز پر قادر کیا تھا اور اُنھوں نے شمال اور مشرق و مغرب کے دور دراز مقامات کا سفر کر کے بے گناہ اور مظلوم قوموں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دی تھی۔ بعض مقامات جہاں اُن کا گزر ہوا بحر اسود اور درمیان "دو کوہ" کے قرب وجوار میں بتائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ دو وحشی اقوام (یاجوج و ماجوج) سے محفوظ رہنے کی غرض سے اُنھوں نے مذکورۂ بالا دو پہاڑوں کے درمیان ایک "سد" تعمیر کیا تھا (جسے لوگ غلطی سے سدِ سکندری بھی کہتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ذوالقرنین کو لوگوں نے سکندر یونانی سمجھا)۔ یہ باتیں انجیل مقدس میں بھی "دانیال کے خواب"[2] میں مذکور ہیں لیکن وہاں اُس "سینگ دار بھیڑ" (مینڈھا) کی تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ وہ بادشاہ میڈیا اور فارس تھا[3]۔ ظاہر ہے کہ یہ بادشاہ سوائے دارائے اول کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کا زمانہ ۵۴۸ - ۵۲۱ سال قبل مسیح گزرا ہے اور "دائرۃ المعارف یہودیان"[4] کے مطابق اسی دارا نے ایرانی سلطنت کو پایدار بنا کر آرمینیا۔ کوہ قاف۔ ترکستان اور وسط ایشیا کو اپنے قبضہ و اختیار میں لایا تھا[5]۔ انجیل میں اس بادشاہ اعظم کے متعلق ذکر ہے کہ اُس نے اپنے اخراجات سے یہودیوں کا معبد تعمیر کیا[6] اور اُن کے ساتھ نہایت دریا دلی کو راہ دیا[7]۔ اسی طرح دارائے اجداد میں سرودش اعظم (سائرس) بھی یہودیوں کے ساتھ رواداری اور رحم و کرم کے لئے معروف گزرا ہے[8]۔ اُس کا دور ۵۲۹ - ۵۴۹ سال قبل پیدائش مسیح تھا اور عہد عتیق کے تذکروں میں سرودش کو بھی "خدا کا چرواہا"[9] "برگزیدہ باری"[10] اور "نجات دہندہ بنی اسرائیل"[11] کے معزز القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے اُسے کفار کی سرکوبی کے لئے قوت عطا فرمائی تھی اور وہ یہووا کا سچا پیرو اور ماننے والا تھا[12]۔ چنانچہ اسی بنا پر ڈاکٹر ہاگ رقمطراز ہیں کہ جن مہذب و معزز القاب سے سرودش کو جو دین زرتشتی کا پابند تھا انجیل مقدس میں یاد کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیش زرتشت اصلاً یہودیت سے زیادہ مختلف نہیں۔ اور یہ حقیقت کہ سرودش اعظم بت پرستی سے علحدہ تھا نہ محض پارسیوں کی مذہبی ادبیات سے ظاہر ہوتی ہے بلکہ ہیرو ڈوٹس جیسے معروف یونانی مورخ کے بیان سے بھی اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے[13]۔ دارائے اعظم کے متعلق دائرۃ المعارف برطانیہ[14] میں مرقوم ہے کہ اُنھی ایرانی سلطنت

---

[1] سورۃ ۱۸ - آیۃ ۹۸-۸۳ - [2] دانیال - باب ۸ - آیۃ ۳ و ۲۰ - [3] جلد چہارم - ص۱۴۱ - ذونوفون کی تالیف سائیروپیڈیا بھی ملاحظہ فرمائیے - [4] دائرۃ المعارف یہودیان - جلد چہارم ص۴۴۳ - [5] عذرا - باب ۴ - آیۃ ۵ - زکریا - باب یکم - [6] لغات الانجیل جلد یکم - ص۱۴۵ - [7] الشعیاء - باب ۴۵ - آیۃ ۲۸ - [8] الشعیاء - باب ۴۵ - آیۃ ۱ - [9] دائرۃ المعارفۃ الانجیل - جلد یکم - [10] کتاب الاشعیاء - باب ۴۵ - آیۃ یکم - [11] دائرۃ المعارفۃ الانجیل - جلد یکم - [12] مقالات ہاگ صفحہ ۵۴ - [13] جلد ششم صفحہ ۸۲۵ (طبع نہم)

کے حدود کوہ قاف اور آرمینیا تک بڑھا کر وحشی اقوام کو اُن اطراف میں زیر کیا تھا۔ پھر اسی بادشاہ کے بارے میں مستند تواریخ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس نے دینِ زرتشتی کو استوار اور پایدار بنایا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دارا نے بنی اسرائیل کے خدا کی پرستش میں اپنی زندگی گزاری[1]۔ کیا ان باتوں کے بعد بھی دینِ زرتشتی کے مذہب الٰہی ہونے میں کسی طرح کے شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

ملا باقر مجلسی ایک مشہور و معروف شیعی عالم اپنی کتاب حیات القلوب میں تحریر فرماتے ہیں[2] کہ کسی شخص نے حضرت علیؓ سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت حال کیا آپ نے فرمایا کہ اُن کا نام ایاش تھا اور وہ خدا کے ایک برگزیدہ بندے تھے[3]۔ پھر اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر امام جعفر صادق کا قول نقل ہے کہ خدا نے ذوالقرنین کو اُنکی قوم پر حکمران بنا کر بھیجا اور مشرق و مغرب کی پوری دُنیا اُن کے ماتحت فرمائی۔ اور جب وہ یاجوج و ماجوج نامی وحشی اقوام کے نزدیک پہونچے تو اپنی قوم کی حفاظت کے لئے درمیان میں ایک دیوار تعمیر کر دی۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحر اسود اور مذکورہ بالا "دیوار" پر تاریخی نظر ڈالی جائے اور انجیل مقدس کے بیان کو قرآن مجید کی روشنی میں پڑھا جائے۔ انجیل میں یاجوج و ماجوج کو وحشی اقوام بتایا گیا ہے جو انتہائے شمال اور شمالی و مشرقی ممالک میں جاگزیں تھیں[4]۔ دائرۃ المعارف یہودیان[5] میں اُنھیں اسکاتھین اقوام میں شمار کیا گیا ہے جو کوہ قاف اور بحر خضر کے قریب بستی تھیں اور اس کی تصدیق دائرۃ المعارف برطانیہ سے بھی ہوتی ہے[6]۔ قرآن شریف میں جس بحر اسود کا ذکر ہے وہ یہی موجودہ زمانہ کا بحر اسود ہے کیونکہ زمانہ قدیم میں یہی اُن وحشی اقوام کا مسکن تھا جو اسکاتھین کے نام سے مشہور تھیں۔ تفسیر جلالین میں یاجوج و ماجوج کو شمالی ایران کی دو وحشی قومیں بتایا ہے اور "دیوار" کی تاویل ترکستانی پہاڑوں سے کی گئی ہے۔ تفسیر بیضاوی میں دو "دیواروں" سے آرمینیا اور آذربائجان کے دو پہاڑ مراد لئے گئے ہیں[7]۔ تقریباً کل مسلمان مصنفین کی اس غلط فہمی کے سبب کہ ذوالقرنین اُنکے خیال میں سکندر یونانی تھا مذکورۂ بالا سد جو درحقیقت دارائے اعظم کا تعمیر کردہ تھا سدِ سکندری مشہور ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ مستند تواریخ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ دارائے اول شاہنشاہ ایران ہی نے آرمینیا اور آذربائجان کے درمیان سکونت رکھنے والی اقوام کو وحشی اسکاتھین کے ظلم سے ۵۱۲ سنہ قبل مسیح میں نجات دلائی تھی۔ دارا کے مشہور

---

[1] دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۲ صفحہ ۸۲۵ - دائرۃ المعارف یہودیان جلد ۴ صفحہ ۴۱ - دائرۃ المعارفۃ الانجیل جلد یکم - [2] جلد اول نسخہ خطی (بانکی پور پٹنہ کتب خانہ) ص۹۵ - [3] داریوش (دارا) اور ایاش میں شباہت لفظی بھی دلچسپ نظر آتی ہے - [4] حزقیل - باب ۳۸ آیۃ ۲ - یوحنا - باب ۲۰ - آیۃ ۸ - تاریخ ایام - باب یکم - آیۃ ۵ - [5] دائرۃ المعارف یہودیان جلد ۶ - ص ۱۹ - [6] جلد دہم ص۳۶ (طبع نہم)
[7] تیسیر القاری فی شرح صحیح بخاری - (باب ذوالقرنین) جلد سوم بھی ملاحظہ فرمایئے۔

عالم کتبوں سے بھی اس کا حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ زرتشت کے مذہب کا سختی کے ساتھ پابند تھا اور محض اسی بنا پر اُسنے موحد یہودیوں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا برتاؤ جاری رکھا۔[1]

بہرکیف اب ہم دوبارہ اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قرآنی تعلیم اور عقاید زرتشتی کے مقابلہ کے بعد اس حقیقت کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں کر سکتے کہ پارسی اپنے مذہبی خیال میں اسلام اور اسکے اُصول سے مخالفت نہیں رکھتے۔ "خدا نے صحیح اور غلط راستوں کی تمیز بہت آسان کردی ہے۔ جو شخص بھی خدا پر ایمان لایا اور شیطان سے تنفر ہوا اُس نے یقیناً ایسی مضبوط رسی پکڑی جو ہرگز کبھی ٹوٹنے والی نہیں"[2] پارسی خدا سے محبت اور شیطان سے نفرت پر اسدرجہ غلو سے کام لیتے ہیں کہ عوام الناس نے انکو دو خداؤں کا پرستار تک سمجھنے میں دریغ نہ کیا۔

ڈاکٹر ہاگ فرماتے ہیں کہ زرتشتی اُصول اور عیسائی و موسائی تعلیمات میں اکثر و بیشتر حیرت انگیز یگانگت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اُسی ذات کو لیجئے جو کل بُرائیوں اور بدکاریوں کی باعث سمجھی جاتی ہے یا پھر عقیدۂ حیات بعد الموت پر غور کیجئے۔ یہ چیزیں ہر سہ مذاہب میں بالکل یکساں خیال کے ماتحت نظر آتے ہیں۔[3]

بالکل اسی طرح دین محمدی میں بھی بہت سی باتیں پارسی عقاید سے ملتی جُلتی معلوم ہوتی ہیں۔ زرتشتیوں نے جس پاکبازانہ زندگی کا عملاً ثبوت دیا ہے اُس سے اُن کے پیغمبر کی اعلیٰ و ارفع تعلیم کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور یقیناً یہی طرز معاشرت باعثِ نجات اُخروی ہے۔ "یحقیق کہ اللہ اُن ہی لوگوں کو جو ایمان رکھتے اور اعمال صالح کرتے اُس باغ میں داخل فرمائے گا جس کے نیچے دریا بہتے ہیں۔"[4]

حیات بعد الممات کے متعلق جسٹس سید امیر علی مرحوم اپنی مشہور تصنیف "روح الاسلام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس طرح کا عقیدہ درحقیقت یہودیوں کے یہاں اوائل میں مطلق رائج نہ تھا بلکہ جب یہودی اور زرتشتی دونوں اقوام یکجا ہوئے (غالباً سائرس اعظم اور دارائے اول کے زمانہ میں) تو آپس کے میل جول سے یہ خیال بھی اُنکے درمیان پھیلا۔ اسی طرح مرحوم شمس العلماء جمشید جی جیونجی مودی نے بھی علمائے مغرب کی سند سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ عیسائی اور یہودی جو ملائکہ اور شیاطین کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں وہ حقیقتاً نتیجہ ہے ژند اوستا کی قدیم و جدید تعلیمات کا۔[5]

---

[1] دائرۃ المعارف برطانیہ۔ جلد ششم صفحہ ۸۲۵۔ دائرۃ المعارف یہودیان جلد چہارم۔ اور دائرۃ المعارف الانجیل جلد اول۔ کتاب اثبات الانجیل جلد اول صفحہ ۵۵۸۔ [2] قرآن سورۂ دوم۔ آیۃ ۲۵۶۔ [3] مقالات۔ صفحہ ۵۔ [4] قرآن سورۂ ۲۲ آیۃ ۲۳۔ [5] مضمون "معرفت انسان"۔ (مقالات مودی صفحہ ۱۹۰-۱۷۳)۔

ہم غالباً بتا چکے ہیں کہ زرتشتی گروہ مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ جب خدائی مخلوق عالم ہیجان و انتشار میں ہوتی ہے تو خدا اُن کی ہدایت کے لئے اپنا کوئی نبی یا رہبر بھیجتا ہے۔ دنیا کے آخری دور میں جو ہادی بنکر آئیگا، اُس کا نام سوشیانس ہوگا اور اُسی کے بعد پھر قیامت رونما ہوگی۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے مہدی یا مسیح موعود سے ملتا جلتا ہے[1]۔

اوستائے مقدس کے سب سے قدیم حصہ "گاتھا" میں دو طرح کی دُنیا کا ذکر ہے۔ ایک تو ہماری موجودہ زندگی والی دُنیا اور دوسرے وہ جس کا دور مرنے کے بعد شروع ہوتا ہے یعنی آخرت کا عالم[2]۔ جہاں ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کی سزا ملے گی[3]۔ موت کے بعد دو فرشتے جو انسان کے نیک و بد اعمال کا حساب لکھتے ہیں روح کو اُس عالم میں پہونچا دیں گے۔ مسلمانوں میں بھی کراماً کاتبین کے متعلق قریب قریب یہی عقیدہ ہے[4]۔ اچھائی اور بُرائی جب میزانِ انصاف میں تل جائے گی تو ارواحِ انسانی کو پُلِ چنوات پر سے گزرنا ہوگا[5]۔ جو نیک بندے ہیں اُن کی اعانت خود پیغمبر زرتشت فرمائیں گے اور وہ بہ آسانی پُل سے گزر کر نجات ابدی پالیں گے[6]۔ بدکاروں اور بد عقیدہ لوگوں کو چنوات کی باریکی اور تلوار کی دھار جیسی تیزی سے زحمتِ شدید پہونچے گی اور وہ پُل پر سے گزر نہ سکیں گے بلکہ گر کر ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں رہ جائیں گے[7]۔ اسلام میں بھی صراط کے متعلق تقریباً یہی خیال ہے۔ جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں سکون و آرام کے سوا پریشانی و غم کا نام نہیں[8]۔ جہنم وہ مقام ہے جہاں فقط بے چینی اور غم و الم ہی کا عالم طاری ہے[9]۔ اگر کسی نیکوکار کافر کے بُرے اعمال نہایت کم درجہ پر ہونگے تو اُسے جہنم میں نہ ڈالا جائے گا بلکہ ایک درمیانی مقام بہشت و دوزخ کے بیچ اُس کا مسکن ہوگا[9]۔ اسی طرح وہ لوگ بھی (یعنی ایماندار) جن کے نیک و بد اعمال برابر درجے کے ہوں گے بہشت میں داخل نہ کیے جائیں گے بلکہ وہاں سے علحدہ ایک دوسری جگہ انھیں عطا کی جائے گی[10]۔ مذکورہ بالا خیال قرآن کے "اعراف" سے ایک حد تک ملتا ہوا نظر آتا ہے[11]۔

[1] دینکرد - جلد اول - صفحہ ۲۹ - (ترجمہ پشوتن سنجانا) - جلد چہارم صفحہ ۲۴۴ - جلد ششم صفحہ ۳۷۹ - قرآن سورۃ ۱۶ - آیۃ ۳۶ - روح الاسلام (مؤلفہ سید امیر علی) وغیرہ وغیرہ - [2] یسنا - باب ۲۸ - آیۃ ۲ - باب ۳۴ - آیۃ ۳ - [3] یسنا - باب ۳۰ آیۃ ۱۰ - باب ۴۵ - آیۃ ۷ - مینو خرد - باب ۲۱ - آیۃ ۱۰ - [4] قرآن سورۃ ۸۲ - آیۃ ۱۲ - ۱۰ - [5] یسنا باب ۲۱ - آیۃ ۱ - بندہشن - باب ۱۲ - آیۃ ۷ - [6] یسنا باب ۴۶ - آیۃ ۱۰ - [7] یسنا - باب ۵۱ - آیۃ ۱۳ - مینو خرد - باب ۲ - آیۃ ۱۲۳ - [8] یسنا - باب ۱۱ - آیۃ ۱۰ - وِیپرد - باب آیۃ ۱ - [9] یسنا باب ۴۳ - آیۃ ۴ - دادستانِ دینیک - باب ۲۷ - آیۃ ۵ - ۲ - [10] شایست ولایست - باب ۶ - آیت ۲ - [11] یسنا - باب ۴۸ - آیۃ ۴ - سورۃ الاعراف ملاحظہ فرمائیے۔

مسلمانوں کی طرح زرتشتیوں کا بھی خیال ہے کہ آخرت میں بداعمالی کی سزا دائمی نہ ہوگی بلکہ ہر شخص ایک وقت معین تک اپنی برائیوں کی سزا بھگت کر ابدی آرام وسکون کے مقام پر پہونچ جائے گا۔[1]

تخلیق کائنات کی داستان بھی پارسیوں کے یہاں اُسی طرح بیان کی جاتی ہے جیسی کہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے یہاں مشہور ہے۔ آدم ابوالبشر یا دنیا کا سب سے پہلا انسان کیونکر پیدا ہوا۔ کتنے دنوں تک زندہ رہا۔ اور نسل انسانی کب اور کس طرح شروع ہوئی کل باتیں جیسی ہمارے یہاں کی روایات میں ہیں وہی زرتشتیوں کے یہاں بھی ہیں۔[2]

ہم کسی گزشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ ژند اوستا میں طوفان نوح جیسے واقعہ کا بھی ذکر ہے جو بزمانۂ شاہنشاہ جمشید ظہور میں آیا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جمشید اسلامی روایات کا سلیمان تھا کیونکہ اُس کے قبضہ واختیار میں بھی اجنّہ تھے اور جن کے متعلق مشہور ہے کہ پائے تخت اصطخر کے عظیم الشان عمارات اور خوبصورت باغات اُنہیں کے بنائے ہوئے تھے۔[3] لیکن طبری[4] نے حضرت سلیمان کو کیقباد کا معصر بتلایا ہے اور لکھا ہے کہ ان دونوں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم تھے یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام نے کیقباد کے جانشین کیکاؤس کو افراسیاب کے زیر کرنے میں مدد بھی پہونچائی تھی۔ خود پیغمبر زرتشت کو اکثر علماء نے حضرت ابراہیم سمجھا ہے۔[5] بہرطور کم ازکم یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ مجوسیوں کا ہادی غیر خدا کا پیغام لیکر لوگوں کی رہبری کو نہیں آیا تھا بلکہ حقیقت میں خدا کا بھیجا ہوا نبی تھا۔ شیخ الاشراق (المتوفی ۵۸۵ھ) نے اپنی کتاب "حکمت الاشراق" میں زرتشت کو انبیائے برحق میں شمار کیا ہے[6] اور حق تو یہی ہے کہ اولیت کے طرۂ امتیاز کا فخر پیغمبر ایران ہی کو حاصل ہے جنھوں نے ایسے زمانہ میں توحید کی علمبرداری کی جبکہ آریائی ایشیا عناصر فطرت کی پرستش میں محو ہورہا تھا اور اُسوقت تک کسی ہستی کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی جرأت نہو سکی تھی۔ زرتشت کے سوا کسی دوسرے کا نام اس سلسلہ میں تاریخ عالم بتلانے سے قاصر ہے۔[7] پروفیسر میکس مُلر کا خیال ہے کہ آریائی اور ایرانی اقوام کا اختلاف جو درحقیقت

---

[1] داد ستان دینک - باب ۱۴- آیۃ ۸- باب ۳۰- آیۃ ۱۵- اور دینکرد جلد ہفتم صفحہ ۴۵۸ ملاحظہ فرمایئے۔ خواجہ کمال الدین مرحوم نے اپنی تصنیف "اسلام اور دین زرتشت" صفحہ ۹۸ میں اس مخصوص عقیدہ کے متعلق ہر دو مذہب میں یکساں خیال موجود رہنے پر نہایت تفصیلی بحث فرمائی ہے۔

[2] معجم البلدان (مولفہ یاقوت) جلد اول۔ کتاب آثار الباقیہ (البیرونی) مروج الذہب (مسعودی) - مسئلہ تخلیق انسان (مولفہ جمشید جی مودی)

[3] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول - کتاب المعارف (ابن قتیبہ) - [4] ترجمہ فارسی (نولکشور) جلد دوم صفحہ ۱۹۹-

[5] روضۃ الصفا (میرخوند) جلد اول جزو اول) - [6] ملاحظہ ہو کتاب الکلام (مولفہ مولانا شبلی) جلد اول صفحہ ۱۴۹ ---

[7] ملاحظہ ہو روح الاسلام (دیباچہ) مولفہ مرحوم سید امیر علی۔

ایک ہی جماعت کے افراد تھے محض زرتشتی تبلیغِ توحید کے بعد ظہور میں آیا[۱]۔ یہاں پر مناسب ہوگا کہ علامہ سر محمد اقبالؔ کی معرکۃ الآرا تصنیف "ترقیِ الٰہیات در ایرانِ قدیم" سے اسی موضوع پر چند سطریں نقل کی جائیں۔ موصوف فرماتے ہیں:۔

"اُس زمانہ میں جبکہ وید کے اشلوک ابھی وسطِ ایشیا میں نظم کا جامہ پہن رہے تھے اور ایرانی آریا ہر چہار طرف خانہ بدوش ہو کر پھر رہے تھے۔ زرتشت کا ظہور ہوا لوگوں میں یکبارگی اطمینان کی زندگی گزارنے کی عادت پڑی اور زراعت و کاشتکاری میں سب کے سب مصروف ہو گئے۔ حکماء اور فلاسفہ کی جماعت میں زرتشت کا درجہ سب سے بلند اور ارفع ہے۔ ایرانیوں کی شاخ آریاؤں سے الگ ہوتی ہی جا رہی تھی کہ زرتشت نے اپنی مذہبی تعلیم سے اُنھیں بالکل ہی جداگانہ قوم بنا دیا"

بدقسمتی سے پیغمبر ایران کے زمانہ کا صحیح طور تعین کرنے کے لئے ہمارے پاس مواد موجود نہیں۔ مغربی علماء نے بابلی اور یونانی مورخین کے بیانات پر کیانی اور اخمنی خاندانوں کو جنکی جداگانہ حکومتیں ایران کی تاریخ میں مسلم ہیں ایک ہی سلسلۂ حکمرانان سمجھ کر زمانہ بعد کے لئے غلط فہمی کا دروازہ کھولا۔ عربوں نے اُن ہی کی تقلید کی۔ حالانکہ ایرانی روایات سے اس بات کا پورا پتہ چلتا ہے کہ یہ دو مختلف خاندان تھے جنھوں نے ایران پر یکے بعد دیگرے حکومت کی[۲]۔ اخمنیوں کی ابتدا سروش اعظم کے عہد سے ہوتی ہے جس نے ۵۴۹ء قبل مسیح میں میڈیا۔ فارس (جنوبی ایران) اور بابل پر تسلط حاصل کیا تھا۔ اس خاندان کا اختتام ۳۳۰ء میں قبل مسیح ہوا۔ زرتشت کا ظہور شاہ گشتاسپ کیانی کے عہد میں بہت عرصہ قبل ہو چکا تھا اور اُسوقت پورا فارس (ایران) میڈیا والوں کے زیر اثر تھا[۳]۔ کیانی خاندان کی حکومت شمالی مشرقی خطۂ ایران پر محدود تھی اور ان کا پائے تخت باختر تھا۔ اور چونکہ ان کا تسلط پورے ایران پر نہ تھا اس لئے لوگوں نے ایرانی حکمرانوں کے سلسلہ میں کیانیوں اور اخمنیوں کو (جن کا قبضہ سارے ملک پر آخر زمانہ میں ہوا) خلط ملط کر کے ایک کر ڈالا[۴]۔ اخمنی پکے زرتشتی تھے اور انھوں نے اس مذہب کو تمام ایران میں رائج کیا[۵]۔ تاریخ میں پیشدادی شاہانِ ایران کے بعد اخمنی خاندان ہی کا نام آتا ہے یا کبھی کبھی یہی اخمنی سلاطین کیانی بھی کہلاتے ہیں۔ البیرونی نے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے[۶]۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام وہ کتابیں جو سیر و تاریخ کے متعلق مغربی زبانوں سے ترجمہ کی گئیں اُن میں سلاطین ایران و بابل کا حال فریدوں کے عہد سے شروع اور دارائے ثانی پر ختم

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول صفحہ ۴۳ — [۲] تجلّیِ ایران قدیم (مولفہ پیتھا والا) اور تاریخ ایران قدیم (مولفہ کرشاسپ) ملاحظہ فرمایئے — [۳] پانچ عظیم الشان سلطنتیں (مولفہ رالنسن) جلد سوم صفحہ ۲۲۴ — [۴] ایضاً صفحہ ۳۲ — اور تاریخ ایران جلد اول باب ۱۳ (مولفہ سائکس) — [۵] پانچ عظیم الشان سلطنتیں۔ جلد سوم صفحہ ۲۲۵ — [۶] آثار الباقیہ صفحہ ۱۱۱ (ترجمہ انگریزی طبع سخاؤ)

ہوتا ہے لیکن جب ہم ان کی تعداد اور اُن کے نام اور زمانۂ حکومت کا مشرقی روایات سے مقابلہ کرتے ہیں تو بیحد اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں واقعہ کی اصلیت یہی ہو سکتی ہے کہ لوگوں نے ایرانی سلاطین کے ناموں کو اُن کے بابلی حکام کے ناموں کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے"۔ حمزہ اصفہانی نے بھی تقریباً یہی باتیں بیان کی ہیں[۱]۔ ان دو مسلم مورخوں کے علاوہ عہد حاضر کے ایک مغربی عالم ڈاکٹر کیتھ جو قدیم آریائی اور ایرانی تواریخ و تمدن کے بہت بڑے ماہر ہیں تحریر فرماتے ہیں[۲] کہ "زرتشت کا ظہور دارائے اخمنی کے زمانہ میں معین کرنا سخت نادانی ہے" اخمنیوں کے عہد سے قبل کیانیوں کی حکومت ایران پر مسلم الثبوت ہے۔ اور جیسا کہ قبل میں ذکر کیا جا چکا ہے پیغمبر ایران نے اپنی تبلیغ کیانی خاندان کے بادشاہ گشتاسپ کے زمانہ میں شروع کی تھی۔ علاوہ ازیں دارائے اعظم (اخمنی) کے وہ کتبے جو کوہ بیستون اور نقش رستم میں کندہ کئے ہوئے پائے جاتے ہیں اُن میں دارا نے کسی نئے مذہب کے رواج دینے کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک ایران میں زرتشتی مذہب قائم ہو چکا تھا اور دارا خود بھی اُس کا پابند تھا۔

(باقی)

محمد طاہر رضوی - ایم - اے

بہار

مولفہ الیاس احمد ایم - اے - ایل - ایل - بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ "در زبان شاعراں" حسن و عشق کی مکمل داستان ہے اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سینکڑوں ہیں اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔

ملنے کا پتہ:- **مینجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ - یوپی**

---

[۱] تاریخ - باب یکم - صفحہ ۱۰　　[۲] رسالہ سہ ماہی تاریخ ہند (مارچ ۱۹۳۵ء)

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

پہلا ایکٹ۔ دوسرا منظر

(قصر شاہی کا صحن۔ آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ صحن کے سامنے شہ نشین ہے جو سنگ مرمر کی مغلی وضع کی جالیوں سے گھرا ہوا ہے۔ صحن کے بیچ میں پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے۔ ہندو اور مسلمان زرق برق درباری لباس پہنے دکھائی دیتے ہیں عورتیں بھی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈھول اور سنکھ بجتا ہے۔ قصر شاہی کا دروازہ اندر کی طرف سے کھول دیا جاتا ہے۔ جس میں سپاہی پہلوان، شمشیر باز اور بھنکیت داخل ہو کر صف بصف قرینہ سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک توپ دغتی ہے اور مہارانی انندراؤ کا ہاتھ پکڑے مع دیوان اور دیگر وزراء کے شہ نشین پر نمودار ہوتی ہے۔ تمام مجمع تین مرتبہ باادب جھک کر سلام کرتا ہے تیسرے سلام کے بعد دیوان صاحب مع رانی و انندراؤ آگے بڑھتے ہیں۔)

نرسنگھ:۔ بھائیو اور بہنو! تمھیں یہ افسوسناک واقعہ معلوم ہے کہ ہمارے محبوب اور ہر دلعزیز راجہ گنگا دھر راؤ کا ایک مہینہ ہوا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے انھوں نے مرنے سے قبل اپنا ولیعہد اور جانشین تبنیٰ کر لیا تھا۔ یہ لڑکا رانی صاحبہ اور وزیروں نے منتخب کیا تھا جسے خود آنجہانی راجہ نے دیکھ کر پسند کر لیا تھا۔ اور اس طرح متوفی راجہ کے جنازہ کی آخری رسمیں ادا کی جا سکی تھیں۔ متوفی راجہ صاحب نے یہ بھی ہدایت اور وصیت کی تھی کہ جب تک متبنیٰ ولیعہد حکومت کرنے کے قابل ہو اسوقت تک ان کی بیوہ رانی لکشمی بائی، جن کا بیحد احترام ہمارے دلوں میں ہے، ولیعہد کی طرف سے ریاست کا نظم و نسق انجام دیں، اگرچہ ابھی تک کمار انندراؤ کی تبنیت گورنر جنرل نے باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کی، لیکن رانی صاحبہ کی خواہش یہ ہے کہ اب بلا توقف تم لوگوں کے سامنے وہ شخص پیش کر دیا جائے جو آیندہ تمہارا فرمانروا ہوگا۔ (انندراؤ کی طرف گھوم کر)۔ لہٰذا یہ میرا گرانقدر اور خوش آیند فرض ہے کہ میں کنور انندراؤ کو

تمھارے سامنے پیش کروں جو سورگیہ راجہ گنگا دھر راؤ کا متبنیٰ بیٹا اور ولیعہد ہے جس وقت ہماری انگریزی سرکار کی طرف سے تبنیت کو تسلیم کئے جانے کی اطلاع رانی صاحبہ کو یا مجھے بحیثیت دیوان پہونچے گی اسوقت تمام وفادار رعایا اور عہدیداران ریاست کی طرف کنور صاحب کی پذیرائی مناسب طور پر عمل میں آئے گی۔ فی الحال ہم اسیقدر کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے آئندہ فرمانروا کے متعلق عام اعلان کردیں۔ "کنور انند راؤ کی جے!" "کنور انند راؤ کی جے!!"

(مجمع نعروں کی تکرار کرتا ہے، اور رانی آگے بڑھ کر اس طرح خطاب کرتی ہے)

رانی :۔ میری محبوب رعایا اور محترم دوستو! جو کچھ پچھلے دنوں محلسرا میں ہوچکا ہے اسے دیوان صاحب نے بالکل صحیح طور پر بیان کیا ہے۔ جس پر میں مزید اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتی لیکن ممکن ہے کہ میرے بعض تازہ کاموں کی وجہ سے آپ لوگوں کے دلوں میں کسی قسم کا اضطراب ہو اس لئے ضروری ہے کہ ان کی کسی قدر توضیح کردیجائے آپ میں سے بعض کو تعجب ہوگا کہ میں ایک ہندو بیوہ ہوکر جس کا دھرم شاستر کے احکام پر عمل کرنا فرض ہے، اپنے محترم شوہر کی وفات کے بعد اس قدر جلد کیوں منظر عام پر آگئی مگر بات یہ ہے کہ اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو میں سوگ کی قدیم رسموں کو ہرگز نظر انداز نہ کرتی۔ لیکن موجودہ زمانہ سخت خطرات سے پُر ہے۔ ایک عجیب قسم کی بیچینی اور گھبراہٹ ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آئے دن نت نئی افواہیں پھیلتی رہتی ہیں۔ الغرض موجودہ فضا تغیر و انتشار سے معمور ہے۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوچکا ہے اور اس کی جگہ دیکھتے دیکھتے ایک نئی بالادست طاقت نے لے لی ہے۔ حال ہی میں ہمارے بعض بہت پُرانے حکمران خاندان مٹ چکے ہیں۔ اور ابھی کل کی بات ہے کہ جو سلطنتیں ہندوستان میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں وہ نابود ہوچکی ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے اگر ہمیں اپنی چھوٹی سی مگر محبوب ریاست جھانسی کی طرف سے بھی فکر و تشویش لاحق ہو۔ اس لئے میرا یہ کہنا ہرگز قابل اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جو حشر ہم سے زیادہ طاقتور اور بڑی ریاستوں کا ہوچکا ہے، اس سے جھانسی کو بچانے کے لئے ہمیں جلد از جلد کوئی تدبیر کرنا چاہئے اور ابتلا و مصائب کے موجودہ نازک دور میں ولیعہد کی وراثت اور حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے اگر میں سرگرم کار ہو جاؤں تو اس سے گویا میرے سورگیہ پتی کی زیادہ عزت و توقیر ہوگی۔ جس طرح دیوی سروپ اہلیا بائی نے سرگرم عمل ہوکر قلمرو ہولکر کو محفوظ رکھا، اسی طرح خدا کی توفیق و نصرت سے میں بھی خدمت وطن کرنے کی کوشش کروں گی، اور تا حدِ امکان جھانسی راج کو بچاؤں گی۔ اسی لئے آج میں آپ لوگوں سے کہتی ہوں کہ آپ صاف صاف بتادیں کہ آپ سورگیہ راجہ کی اس دور اندیشی کو کہ انھوں نے کمار انند راؤ کو اپنا ولیعہد بنایا، پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا نہیں؟ ہمیں چاہئے کہ اس بارہ میں انگریزوں کے دل میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہ رہنے دیں کہ جھانسی کے لوگ حکمران خاندان کے وفادار ہیں۔ نیز یہ کہ ستارہ یا ناگپور کے حالات خواہ کچھ بھی ہوئے ہوں لیکن جھانسی اپنے موجودہ حکمرانوں کے ماتحت مطمئن ہے۔ ہم اپنی اس چھوٹی سی ریاست میں اپنی آزادی و

خود مختاری کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت و قیام میں ہم کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں گے۔

(رانی کے آخری الفاظ پر ہر طرف سے تعریف کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اور تقریر ختم ہوتے ہی "رانی لکشمی بائی کی جے" کا نعرہ بلند ہوتا ہے مجمع نعرہ کی تکرار کرتا ہے جس سے تمام محل گونج اٹھتا ہے۔ اسکے علاوہ "انند کمار کی جے" کے نعرے بھی لگائے جاتے ہیں۔ پھر رانی مجمع کا سلام لیتی ہے، انند راؤ کا ہاتھ پکڑ کر چلی جاتی ہے، اس کے پیچھے پیچھے دیگر وزرا بھی چلے جاتے ہیں۔ صرف دیوان رہجاتا ہے، جو بازیگروں پہلوانوں وغیرہ کو اپنے کرتب دکھانے کا حکم دیتا ہے۔ اور خود بھی چلا جاتا ہے۔ باجہ بجتا ہے اور کھیل شروع ہوجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ترپ دغتی ہے۔ فوراً سب لوگ باادب صف بستہ ہوجاتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے جس میں سے انند راؤ سادہ لباس میں اور راؤ آپا تلوار ہاتھوں میں لئے داخل ہوتے ہیں۔ اسی وقت رانی صاحبہ، دیوان اور دیگر وزرا بھی شہ نشین پر نمودار ہوتے ہیں راؤ آپا اور انند کمار شہ نشین کی طرف اپنی تلواریں اٹھا کر سلامی دیتے ہیں۔ سلام کا جواب اوپر سے ملتا ہے۔ بعد ازاں مجمع کی طرف رُخ کر کے سلامی دی جاتی ہے۔ مجمع بھی جواباً تین سلام کرتا ہے اس کے بعد راؤ آپا اور انند کمار دونوں شمشیر زنی کرتے ہیں۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس کے بعد پہلوانوں، بازیگروں وغیرہ کے تماشے شروع ہوجاتے ہیں۔ راؤ آپا کا پاؤں پھسلتا ہے وہ گر پڑتا ہے اور انند کمار اس کے سینہ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ رانی "کمار انند کی جے" کا نعرہ لگاتی ہے۔ پردہ گرتا ہے اور ہر طرف سے "رانی صاحبہ کی جے" اور "جھانسی راج کی جے" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔)

پہلا ایکٹ۔ تیسرا منظر

(دوسرے دن غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد قصر شاہی کا دربار آراستہ ہے۔ وسط میں تخت رکھا ہوا ہے، داخلہ کا دروازہ دور فاصلہ پر سامنے نظر آتا ہے، پردہ اٹھتا ہے اور دیوان، ماما صاحب، دو دیگر وزرا اور میجر الیس (اس زمانہ کی سُرخ اور نیلی وردی پہنے) نظر آتے ہیں میجر صاحب گدی کے قریب اور اس کے برابر ماما صاحب بیٹھے ہیں۔ دیوان ان کے سامنے کھڑا ہے۔ دوسرے دو وزیر کسیقدر فاصلہ پر آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔)

میجر ایلیس :- دیوان صاحب! میں عجب شش و پنج میں ہوں۔ اگر میرے دل میں متوفی راجہ صاحب کا احترام نہ ہوتا تو یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرتا اور اب میجر مالکم مجھ سے ضرور جواب طلب کریں گے کہ جب رانی گورنر جنرل سے کھلم کھلا سرتابی کر چکی تھی تو میں نے اس سے ملاقات کرنا کیوں منظور کیا۔ یہ معاملہ بہت نازک ہو گیا ہے اور گزشتہ چند سال سے میں ذاتی طور پر جھانسی راج کی فلاح و بہبود میں جو دلچسپی لیتا رہا ہوں اس کا اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔

نرسنگھ :- میجر صاحب! پرماتما جانتا ہے کہ مجھے اور ماما صاحب کو آپ کی حالت کا بخوبی احساس ہے (ماما صاحب بھی سر ہلا کر ہاں میں ہاں ملاتے ہیں) اور ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ صبر و استقلال اور اپنی حسب معمول فیاضی سے کام لیتے رہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ ہم لوگوں نے رانی صاحبہ کو روکنے کی ہر چند کوشش کی مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ بلکہ اُلٹی ہم کو یہ دھمکی دی کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دیں گی کہ ہم جھانسی راج کے الحاق کے بارہ میں انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔

ماما صاحب :- میجر صاحب! میں آپ سے بہ حلف عرض کرتا ہوں کہ ہم لوگ بالکل مجبور تھے۔ میں نے رانی کو بہت سمجھایا مگر اُس نے انکار کر دیا۔

میجر ایلیس :- (سوچ کر) آپ کہتے ہیں کہ لڑکے کی صغر سنی کے زمانہ میں وہ ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھنگی۔

دونوں :- جی ہاں!

میجر :- کیا آپ دونوں صاحبوں کے دشمن بھی ہیں؟

نرسنگھ :- نہیں! کم از کم ہمارے محکمہ جاسوسی کو تو اس کا علم نہیں ہے۔

میجر :- (معنی خیز طور پر ماما صاحب سے) ہوں! آپ کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ تو گستاخی معاف! کیا رانی صاحبہ کا کوئی دوست ایسا ہے۔ جس سے ان کے بہت زیادہ گہرے تعلقات ہوں؟

ماما صاحب :- بحیثیت رانی کے ان کے مشیر کار ضرور ہونے چاہئیں۔ لیکن بلحاظ وفاداری وہ اپنے مرنے والے شوہر پر اب بھی جان دیتی ہے گویا وفاداری شوہر کی زندگی میں بھی صرف فرض کی حیثیت رکھتی تھی اور اس میں کوئی جذبۂ لطف و محبت شامل نہ تھا۔

(گھنٹا بجتا ہے سب چونکا ہو جاتے ہیں۔ میجر اور ماما صاحب دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے دو وزیر بھی آکر دیوان صاحب کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں)۔

میجر :- صاحبو! یہ معاملہ بہت ہی نازک ہو گیا ہے۔ واقعی بہت نازک۔ اور نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو۔ لیکن آپ سمجھ لیجئے۔ میں رانی صاحبہ سے تنہا ملاقات نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا گویا انھیں جھانسی راج کا فرمانروا تسلیم کر لینا ہے۔

اور جو کچھ احکام مجھے دئے گئے ہیں وہ بھی آپ خوب جانتے ہیں۔ پس آپ پوری طرح سمجھ لیجئے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہو جب تک آپ لوگ موجود رہیں گے، میں رانی صاحبہ کے سامنے رہوں گا۔ اگر آپ لوگ ہٹ جائیں گے تو میں بھی چلا جاؤنگا۔

(کمرہ میں دور سامنے کی طرف سے ایک جلوس داخل ہوتا ہے۔ آگے آگے دو لڑکے چنور لئے ہوئے ہیں ان کے پیچھے چار عورتیں خاصدان وغیرہ لئے ہوئے ایک کشتی میں شربت کی بوتل اور چند بلوریں گلاس۔ دو آدمی زرکار پردہ تانے آتے ہیں ان کے پیچھے رانی اور گنگا بائی داخل ہوتے ہیں۔ تمام وزرا ماماصاحب اور اہلِ دربار جھک کر سلام کرتے ہیں۔ میجر ایلیس جس کے ہاتھ میں پروں کی کلغی دار خود ہے جھک کر سلام کرتا ہے۔ رانی گدی کے سامنے ایک تخت پر بیٹھ جاتی ہے۔ میجر ایلیس کی طرف سے پردہ رہتا ہے۔ خادم خنجر بکف پردہ کے پاس استادہ ہوجاتے ہیں۔ گنگا بائی بھی رانی کے پاس بیٹھتی ہے)

رانی :۔ دیوان صاحب! آپ نے ہمارے معزز مہمان کے لئے کیا سامان تفریح بہم پہونچایا ہے؟

نرسنگھ :۔ (پردہ کے قریب آکر)۔ میں نے تو میجر صاحب سے اصرار کے ساتھ عرض کیا تھا کہ گویوں اور ناچنے والیوں کو طلب کرلیا جائے لیکن انھوں نے عذر پیش کرکے انکار کردیا۔ اور فرمانے لگے کہ دن بھر سخت کام کرتے گزرا ہے۔ خستہ ہوگیا ہوں اس لئے رات کو سویرے ہی سو کر علی الصباح یہاں سے دور کسی ضروری کام کو چلا جاؤں گا۔

رانی :۔ اوئی! میجر صاحب کو جھانسی سے چلے جانے کی اسقدر جلدی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ وہ ہمارے یہاں تشریف لانا ہمیشہ پسند کرتے ہیں اور خود آپ نے ہی تو کہا تھا کہ وہ ہمارے بڑے دوست ہیں۔

(دیوان میجر ایلیس کی طرف دیکھتا ہے جو کچھ پس وپیش کے بعد اُٹھ کر پردہ کے قریب آتا ہے)

میجر :۔ رانی صاحبہ! نہیں یہ بات نہیں، میں جھانسی آنے میں ہمیشہ خوش رہا اور خوش رہوں گا۔ لیکن آج کل، جیساکہ آپ کو بھی معلوم ہے، صورت حالات کسی قدر نازک ہوگئی ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ کمار صاحب کی تہنیت کی منظوری ملنے سے قبل جو میں آپ کے دربار میں حاضر ہوگیا ہوں اس پر مجھ سے ضرور جواب طلب ہوگا۔

رانی :۔ میجر صاحب! میں آپ کو ہرگز پریشان کرنا نہیں چاہتی خصوصاً اس لئے کہ آپ جھانسی راج کے خیر خواہ ہیں۔ میں مرہٹہ قوم کی عورت ہوں اس لئے میں آپ کو حکم سے سرتابی کرنے کی ہرگز ترغیب نہ دوں گی۔ مگر چونکہ اب آپ یہاں موجود ہی ہیں، اس لئے اگر تھوڑا سا رقص و سرود ہوجائے تو کیا مضایقہ ہے؟ اور اس بات سے تو آپ خود واقف ہیں کہ اس ملک کے رہنے والے کسی اہم کام کو ہاتھ لگانے سے پہلے دل و دماغ کی کسی قدر تفریح بہت پسند کرتے ہیں علاوہ ازیں ایسا شغل نہ صرف ہمارے مہمانان عزیز کا حق ہے بلکہ ہماری خودداری بھی اسی امر کی متقاضی ہے۔ بہرحال اگر آپ بہت زیادہ خستہ ....

میجر :۔ (جوش کے ساتھ مگر پھر کچھ سنبھل کر)۔ نہیں رانی صاحبہ ہرگز نہیں! بلکہ میں تو آپ کی خاطر و مدارات کو

اپنے لئے باعث عزت و مسرت سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ شاید اسوقت آپ خود ہی اس قسم کے مشاغل تفریح کی طرف مائل نہ ہوں۔

رانی :۔ (حاکمانہ لہجہ میں)۔ میجر صاحب! آج کی تاریخ سے جھانسی راج کی عنانِ حکومت میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ اور اگرچہ رنڈاپے کا سوگ میں حتی الامکان حسب رواج زمانہ میں مناؤں گی، لیکن راج کے متعلق جو فرائض مجھ پر عائد ہوتے ہیں وہ سب باتوں پر مقدم رہیں گے۔ لہذا آپ میرے آرام و سہولت کا کچھ خیال نہ فرمایئے میرا مرتبہ اس امر کا متقاضی ہے کہ میں جھانسی میں اپنے معزز مہمان کے شایان شان کوئی انتظام کروں اور تاوقتیکہ آپ ہمارے خیر مقدم کو قبول کرنے سے قطعی انکار نہ کر دیں میں گویوں اور اپنے یہاں کی ایک بہترین رقاصہ کو ضرور طلب کروں گی۔

(خفیف سا سکوت۔ میجر ایلیس دیوان صاحب کی طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ ادھر گنگا بائی پردہ کے پیچھے سے میجر کو جھانک کر دیکھتی ہے۔ اور پھر پیچھے ہٹکر آنکھوں ہی آنکھوں میں تمام کیفیت رانی سے بیان کرتی ہے۔ اگرچہ میجر ایلیس کی طرف سے پردہ ہے مگر تمام دربار رانی اور گنگا بائی کو دیکھ رہا ہے)

رانی :۔ دیوان صاحب! میرا بائی کو حکم دیجئے، سازندوں کو فہمائش کر دیجئے کہ زیادہ شور نہ ہو۔ میجر صاحب اور آپ سب صاحب تشریف رکھیں۔ اور مجھے بزم رقص و سرود کی شرکت سے معاف فرمائیں مگر یہ سمجھ لیں کہ آپ صاحب کی تفریح سے میرا دل خوش ہوگا۔

(رانی اور گنگا بائی اُٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ میجر صاحب، وزراء اور دیگر درباری اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد میرا بائی کو جو جھانسی دربار کی سب سے اچھی اور مشہور رقاصہ ہے لیکر آتے ہیں۔ میرا بائی پردہ کے پاس آکر مجرا و بندگی کرتی ہے۔ بعد ازاں رقص شروع ہوتا ہے۔ میجر صاحب خوش ہو کر رقاصہ کو انعام دیتے ہیں۔ گنگا بائی دبے پاؤں پس پردہ آکر چاروں طرف جھانکتی ہے اور پھر رانی کو اشارہ سے بلاتی ہے۔ مگر رقص و سرود کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے)

رانی :۔ لالہ جی! میرا بائی، اور سازندوں کو معقول انعام دیا جائے۔ ان لوگوں نے آج بڑی محنت سے میجر صاحب، اور اہلِ دربار کا جی خوش کیا ہے۔

(میرا بائی جھک جھک کر پہلے پردہ کو، پھر میجر ایلیس، دیوان صاحب، دیگر وزراء، اور معززین دربار کو سلام کرتی ہے)۔

رانی :۔ اچھا تو اب میں میجر صاحب سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوں، پتاجی آپ، دیوان صاحب اور

سب لوگ یہاں سے جا سکتے ہیں کیونکہ میں میجر صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کروں گی۔

(میجر ایلیس، دیوان اور ماما صاحب جلد جلد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ دیوان کے اشارہ سے سب لوگ ہٹ جاتے ہیں)

نرسنگھ:- رانی صاحبہ! یقیناً میں، اور سب لوگ آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے طیار ہیں لیکن میجر صاحب نے ہم سے فرمایا ہے کہ ان کا رانی صاحبہ سے تخلیہ میں ملنا ممکن نہ ہوگا۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے یور ہائنس سے تخلیہ میں ملاقات کی تو ان کے اس فعل کو آپ کی نیابت تسلیم کر لینے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ اس لئے میجر صاحب مجبور ہیں کہ آپ سے گفتگو کرنے کے وقت جھانسی راج کے تمام وزرا موجود رہیں۔ حضور میری اس ناچیز گزارش کو قبول فرمائیں۔ کیونکہ موجودہ صورت حال ہم سب کے لئے بہت نازک ہے۔

رانی:- (بگڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے)۔ اچھا تو یوں کہئے کہ ملکہ معظمہ اور گورنر جنرل کا نمائندہ جھانسی میں صرف اس لئے آتا ہے کہ وہ ریاست کے خلاف ریاست کے ملازموں سے ساز باز کرے اور کیا ان میجر صاحب بہادر کا جھانسی راج سے اظہار محبت اور میرے بدمزاج اور نالائق وزیروں کے مجھ سے اظہار وفاداری کا یہی طریقہ ہے؟

ماما صاحب:- بیٹی شانتی سے کام لو۔ تم نہیں سمجھتیں کہ تمہارا ایسا کہنا ہمارے معزز مہمان پر ظلم کرنا ہے۔ جس طرح ہم لوگ یعنی تمہارے ملازم تمہاری ہر بات کی تعمیل کرتے ہیں، اسی طرح میجر صاحب بھی اپنے افسران بالادست کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ جب تک انگریزی ارباب حل وعقد کمار صاحب کی تبنیت تسلیم نہیں کر لیں گے اسوقت تک میجر صاحب صرف دیوان صاحب اور وزیروں سے تعلق رکھنے پر مجبور ہیں۔ اصول یہی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان سے جھانسی راج اور دیگر ریاستوں میں امتیاز کرنے کی توقع رکھی جائے۔

رانی:- (تلخ لہجہ میں) اچھا اگر میجر صاحب مجھے جھانسی راج کا نمائندہ سمجھ کر ملاقات نہیں کر سکتے تو مجھ سے عورت ذات ہی سمجھ کر بات چیت کریں، دنیا کا کوئی قاعدہ اس امر کا مانع نہیں کہ مرد کسی عورت سے بات چیت کرے اور خصوصاً انگریزوں میں تو کوئی ایسا قاعدہ ہے ہی نہیں کیونکہ یہ لوگ عورتوں سے اسقدر دلچسپی لیتے ہیں کہ بمقابلہ اپنی بیویوں کی دوسروں کی بیویوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

میجر:- (مصالحانہ لہجہ میں) رانی صاحبہ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی دعوت قبول کرنا میرے لئے بہت کچھ باعث عزت ہوگا۔ لیکن میں یہ خیال نہیں کر سکتا کہ آپ عدول حکمی کی سزا میں میری بے عزتی اور ملازمت سے برطرفی کو گوارا کریں گی۔

رانی:- لیکن اگر آپ مجھ سے چند لمحے اس طرح باتیں کریں جیسے ایک مرد کسی عورت سے گفتگو کرتا ہے، تو اس کی خبر کس کو ہوگی؟ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، اس واقعہ کی کسی کو اطلاع نہ ہوگی، خواہ کمار اندر راؤ کی تبنیت کے

بارہ میں آیندہ کچھ بھی ہوتا رہے۔ اور آپ اس بات سے بھی مطمئن رہیں کہ نہ تو دیوان صاحب، نہ دیگر وزراء، اور نہ میرے والد اس بارہ میں کوئی گفتگو کریں گے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں سے بگاڑ نہ ہو۔ (طنزیہ لہجہ میں) یا یوں کہئے کہ وہ زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔

(دیوان صاحب، ماما صاحب اور دوسرے دونوں وزیر گھبرا جاتے ہیں اور ندامت سے سرنگوں ہو جاتے ہیں)

میجر:- (نرم ہوکر) بہت اچھا رانی صاحب! اگر آپ یہ معاملہ اس طرح رکھنا چاہتی ہیں تو بہتر ہے میں طیار ہوں،

(دیوان صاحب) -چونکہ رانی صاحبہ کا منشا یہی ہے اس لئے آپ ہم کو تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ باہر ایک حرف زبان سے نہ نکلے۔

رانی :- اور تو اس کے لوگوں کے بھی کان کھول دئے جائیں کہ اگر کسی قسم کی سرگوشیاں میرے لئے ہوئیں تو سخت سزا دونگی۔

(نرسنگھ ماما صاحب کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتا ہے بعد ازاں پردہ کو سلام کرکے چل دیتا ہے۔
دیگر وزراء بھی سامنے کے دروازہ سے اس کے پیچھے پیچھے چلے جاتے ہیں)۔

ماما صاحب :- (پردہ کے پاس جاکر) میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپ میرا یہاں سے چلا جانا پسند نہ کریں گی۔ کم ازکم اپنی رعایا کے خیالات اور محسوسات کا تو آپ کو ضرور خیال ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ لوگ ضرور اعتراض کریں گے کہ سورگیہ راجہ کی بیوہ رانی ایک انگریز سے تنہا ملاقات کرتی ہے۔ دل میں سوچ لو کہ ہمارے دشمن بندیلکھنڈ والے یہ افواہ مشہور کیا کہیں گے کہ جھانسی کی رانی نے ایک انگریز افسر سے تنہا ملاقات کرنے پر اصرار کیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ میجر صاحب میری اس آزادی کو معاف فرمائیں گے کہ میری گفتگو میں ان کا نام آیا۔

(میجر صاحب کی طرف دیکھ کر آہستہ سے آداب عرض کرتا ہے)

رانی :- پتا جی! چونکہ آپ نے صاف گوئی سے کام لیا ہے اس لئے اگر میں بھی آپ کو صاف گوئی سے جواب دوں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اور میں امید کرتی ہوں کہ میجر صاحب مجھے اسی طرح معاف فرمائیں گے جیسے کہ آپ کو پتا جی! آپ میری رعایا کے خیالات اور محسوسات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، لیکن آپ کو اسوقت میرے جذبات کا خیال نہ آیا جب آپ نے مجھے ایک ایسے شخص کے حبالۂ نکاح میں دیدیا جو عمر میں میرے نانا کے برابر تھا۔ اور قوائے جسمانی کے لحاظ سے قطعی بیکار- آپ کو اسوقت کچھ خیال نہ آیا جب آپ نے مجھے اوائل عمر کی بیوگی کی مصیبت میں پھنسایا۔ مجھے جو اسوقت بھی جوان ہے اصور تدار ہے، جس کا ارمان تھا کہ بچوں کی ماں بنے، جو شوہر کی معیت اور محبت کی خواہاں تھی لیکن جو بقصور ان تمام باتوں سے محروم کردی گئی۔

(پردہ ہٹا کر میجر ایلیس کے سامنے آجاتی ہے جو رانی کے حسن وجمال کو دیکھ کر حیران رہجاتا ہے)

پتاجی! اب میں اپنی ذات اور اپنی زندگی کی آپ مالک رہوں گی اور اپنے اغراض و مقاصد اور جھانسی کے لئے جان قربان کردوں گی مجھے راجہ گنگادھر راؤ کی رانی بنا کر آپ اس مرتبۂ اعلیٰ پر پہونچ گئے ہیں جس کی آپ کو تمنا تھی۔ اب اس اعزاز اور منصب کو قائم رکھئے۔ لیکن آیندہ اپنے معاملات طے کرنے کے لئے مجھے آزاد چھوڑ دیجئے۔

(ماما صاحب کسی قدر شش و پنج کے بعد رانی اور میجر ایلیس کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ اور کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ رانی ادھر اُدھر دیکھ کر مسند پر بیٹھ جاتی ہے۔ میجر صاحب بھی سرک کر رانی کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور گنگا بائی اُٹھ کر کمرہ کے ایک گوشہ کی طرف چلی جاتی ہے)۔

رانی :۔ (کچھ سکوت کے بعد حزیں آواز سے) میجر صاحب! کیا ملکہ معظمہ بھی کبھی تنہائی محسوس کرتی ہیں؟

میجر :۔ (سٹ پٹا کر)۔ رانی صاحبہ! اس امر پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ اور لوگوں کی طرح سے ہماری نیک اور شریف ملکہ وکٹوریہ بھی ضرور کبھی تنہائی محسوس کرتی ہوں گی، اگرچہ ان کی شادی کو اب تیرہ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اور اپنی اہلی زندگی سے وہ بہت خوش ہیں۔

رانی :۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کے موجودہ شوہر کا انتقال ہو جائے تو کیا آپ کے خیال میں وہ دوسرا نکاح کرلیں گی؟ آپ کے یہاں ازدواج ثانی کا رواج ہے یا نہیں؟

میجر :۔ ہاں رانی صاحبہ ہمارے یہاں اس کا رواج ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہماری قوم کی وہ تمام عورتیں جو بیوہ ہو جاتی ہیں دوسرا شوہر کرلیتی ہیں۔ ہماری قوم کی بعض بیوائیں اپنی محبت میں اسقدر صادق ہوتی ہیں کہ وہ بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے نام پر بیٹھی رہتی ہیں۔ اور یونہی زندگی گزار دیتی ہیں۔ ہاں بعض ایسی ہیں جو دوسرا نکاح کرنا پسند کرتی ہیں یا حالات انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد اُن سے بہت زیادہ ہے۔ (کسی قدر مسکرا کر) کہتے ہیں کہ کنوارے مرد، جیسا کہ میں ہوں، بیوہ عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اور اسی وجہ سے انگلستان میں یہ مثل مشہور ہے کہ "بیوہ عورتیں خطرناک ہوتی ہیں"۔

رانی :۔ آپ نے یہ تو ضرور سنا ہوگا کہ کلکتہ میں اس معاملہ پر بحث ہو رہی ہے کہ ہندو عورتوں کو دوسرا نکاح کرنیکی اجازت دی جائے۔

میجر :۔ (رانی کی طرف غور سے دیکھ کر)۔ ہاں! میں نے یہ بات سُنی ہے اور مجھے اس معاملہ سے دلچسپی بھی ہے۔ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

رانی :۔ (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے)۔ ہاں معمولی درجہ کی عورتوں کے لئے تو یہ تجویز بہت مفید ہو سکتی ہے لیکن اونچی ذات کی کوئی ہندو بیوہ، اگر دل میں یہ خواہش رکھتی بھی ہو تو دوسرا شوہر کرنے کی جسارت نہیں کرے گی کیونکہ ایسا کرنے سے ہندو سوسائٹی میں وہ اسقدر حقیر و ذلیل ہو جائے گی کہ لوگ اسے اچھوت کی طرح سمجھنے لگیں گے اور

وہ زندگی پر موت کو ترجیح دینا پسند کرے گی۔

میجر:۔ تو کیا رانی صاحبہ! آپ کے خیال میں ایک اونچی ذات کی ہندو بیوہ کے لئے یہی زندگی مناسب ہے کہ وہ دنیا بھر سے الگ تھلگ رہے!

رانی:۔ میجر صاحب! ہمارے یہاں کے رسم و رواج کا سمجھنا آپ کے لئے اسی قدر مشکل ہے جس قدر کہ ہمارے لئے آپ کے رسم و رواج کا سمجھنا۔ ہندو عورتوں کی پرورش اس عقیدہ کی فضا میں ہوتی ہے کہ بیوی اپنے شوہر کا ایک جزو لاینفک ہے۔ جس کے بغیر اس کی زندگی مکمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کسی ہندو لڑکی کو اچھا شوہر مل جاتا ہے تو وہ فرض سمجھتی ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد بھی وہ اس کی وفادار رہے۔ اسی وجہ سے ہندو بیوائیں ستی ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر چونکہ سرکار انگریزی نے ستی کی رسم ممنوع قرار دیدی ہے اس لئے وہ اپنے شوہر سے دیگر طریقوں پر اظہار وفاداری کرنے پر مجبور ہوتی ہے اسی سبب سے میں خیال کرتی ہوں کہ ہندوؤں میں اونچی ذات کی بیوائیں دوسری شادی کرنا کبھی پسند نہ کریں گی۔

میجر:۔ لیکن ان عورتوں کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے جن کی اہلی زندگی مسرور ثابت نہیں ہوئی؟ یا جن عورتوں کے خاوندوں نے ان سے بُرا برتاؤ کیا تھا، کیا وہ بھی اپنے پہلے شوہر کے نام پر وفادار بیٹھی رہیں؟

رانی:۔ ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے خاندان کی وفادار رہیں، اپنی ذات یا برادری پر جان نثار کر دیں یا اپنے راج کی خدمت کرتے کرتے فدا ہو جائیں (مسند سے اُٹھتے ہوئے)۔ یہی وہ اغراض ہیں جن کی تکمیل کے لئے اب میں زندہ ہوں، اور میجر صاحب! یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لئے میں نے آپ سے تنہا بات چیت کرنے کی خواہش کی۔

میجر:۔ (خود بھی اُٹھتے ہوئے)۔ رانی صاحبہ! تا حد امکان مجھے آپ کی مدد کرنے میں بیحد مسرت ہوگی .... میں آپ کے خیالات و جذبات کو سمجھتا اور ان کو بنظر استحسان دیکھتا ہوں۔

رانی:۔ (جذبات کو روکتے ہوئے) میجر صاحب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں آپ پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ لہٰذا میں جو کچھ بھی آپ سے کہوں گی وہ بالکل صاف صاف کہوں گی۔ آج شام جب میں نے آپ سے تنہا ملنے پر اصرار کیا تھا تو میں یہ چاہتی تھی کہ آپ سے دو سوال دریافت کروں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب متوفی راجہ نے انند کمار کی صغر سنی میں مجھے جھانسی راج کے لئے نائب السلطنت نامزد کرنا چاہا تو آپ نے اس کی مخالفت کیوں کی تھی؟

میجر:۔ (سرنگوں ہو کر غور کرتا ہے)۔ اچھا اب میں آپ سے تمام حقیقت آشکار کئے دیتا ہوں بشرطیکہ آپ رازداری کا وعدہ فرمائیں (رانی سر کے اشارہ سے وعدہ کرتی ہے)۔ وجہ یہ تھی کہ میں آپ کے وزیروں کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے میرے دل میں اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ آپ کے باپ کے ساتھ ملکر محض اپنے ذاتی اغراض کے لئے جھانسی راج میں سیاہ و سفید کے مالک ہو جائیں گے۔ اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے آپ کو اپنا آلۂ کار بنا لیں گے۔

رانی :- کیا اب بھی آپ کا خیال وہی ہے ؟

میجر :- نہیں رانی صاحبہ ! اب میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اب تو یہ خیال ہے کہ جس طرح اہلیا بائی نے اندور کو بچایا، غالباً اسی طرح آپ بھی جھانسی راج کو بچا سکیں گی۔

رانی :- (مذہبی جوش میں آکر) آہ میجر صاحب ! کاش میں دیوی سروپ اہلیا بائی کے نقش قدم پر چلنے کے قابل ہوتی وہ اوتار ہے اور میں اس کی پجاری۔ وہ گرو ہے اور میں اس کی چیلی۔

میجر :- اور رانی صاحبہ ! آپ کا دوسرا سوال !

رانی :- (پہلے پس وپیش کرتے ہوئے اور پھر جرأت کے ساتھ) - میجر صاحب ! آپ ایک قابل اعتماد دوست ہیں۔ لہذا مناسب ہوگا کہ ہم دونوں صفائی سے گفتگو کریں۔ (آواز دھیمی کر کے)۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ جو مصیبت جھانسی راج پر نازل ہوتی نظر آتی ہے، کیا وہ گورنر جنرل سے لیکر آپ تک، کسی شخص کو کچھ دے دلا کر ٹل سکتی ہے ؟ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو ازراہِ مہربانی بتائیے کہ کتنی رقم کس کو نذر کی جائے۔ (بلند آواز سے) جو کچھ بھی ہو میں نے جھانسی کو بچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

میجر :- (اٹھ کر گویا جانا چاہتا ہے)۔ رانی صاحبہ ! آپ اپنا اور میرا دونوں کا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا، اور سرکار انگریزی کے ساتھ رشوتوں سے معاملہ طے نہیں کیا جاتا۔

رانی :- (طنزیہ) ممکن ہے میجر صاحب زمانہ بدل گیا ہو لیکن آدمی جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آجکل انگریزی افسران اپنے لئے روپیہ نہ لیتے ہوں، مگر جس گورنمنٹ کے وہ ملازم ہیں وہ روپیہ کے بجائے ہماری املاک اور جائدادیں غصب کرتی رہتی ہے۔ (کسیقدر نرمی سے)۔ میجر صاحب ! معاف فرمائیے میں آپ کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ ایک دل شکستہ اور مصیبت زدہ عورت کی مفوات کو معاف کر دیجئے کیونکہ وہ دنیا کے طور وطریق سے واقف نہیں۔

میجر :- (رانی کی طرف متوجہ ہو کر)۔ میں تو آپ سے پیشتر ہی عرض کر چکا ہوں کہ اپنی قابلیت کی حد تک میں آپ کی مدد کرنے کو طیار رہوں۔ اسا آپ ہی فرمائیں کہ میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں ؟

رانی :- (دھیمی مگر لجاجت آمیز آواز میں)۔ میجر صاحب ! مجھے آپ کی مدد سے زیادہ کچھ اور درکار ہے۔ آپ مجھ سے اس بات کا وعدہ کیجئے کہ میری جھانسی مجھ سے نہ چھینی جائے گی۔ یہ میری جان ہے، یہ میری اولاد ہے، یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ اور خواہ کچھ ہو، میں جھانسی کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دوں گی۔ (قریب آکر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) - میجر صاحب ! ابھی آپ کنوارے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ روپیہ نہیں تو ایک صاحب عصمت ہندو بیوہ کا نرم ونازک جسم آپ کو راضی رکھ سکے —— بہرحال اب میں صرف جھانسی کے لئے جیتی ہوں، اور میں اس کے لئے ہر چیز

قربان کر سکتی ہوں [1]

(تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر دیکھتے ہیں۔ اسی اثناء میں کسی پٹاخہ یا کسی چیز کے دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دونوں چونک جاتے ہیں اور آواز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ گنگا بائی دوڑ کر شہ نشین کی طرف جاتی اور فوراً چلاتی ہوئی واپس آکر کہتی ہے "آتشبازی شروع ہوگئی ہے" یہ کہہ کر وہ پھر شہ نشین کی طرف دوڑ جاتی ہے اور وہاں "کمار انند کی جے" کے نعروں میں شریک ہو جاتی ہے جو مجمع کی طرف سے بلند ہو رہے ہیں۔)

میجر:۔ رانی صاحبہ! یہ ممکن ہے کہ ہم انگریز لالچی، سخت گیر یا غاصب ہوں، لیکن جب ہم کسی شخص میں جرأت و دلیری کا جوہر دیکھتے ہیں تو اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپ کی قربانی غیر ضروری ہے۔ اگر جھانسی کو بچانے کے لئے کوئی تدبیر ہو سکیگی تو آپ یقین رکھیں کہ میں اسے ضرور انجام دوں گا۔

(جھک کر آداب بجا لاتا ہے اور جھکا ہی جھکا اُلٹے پاؤں ہٹ کر کمرہ سے چلا جاتا ہے۔)

رانی:۔ (دو تین مرتبہ سلام کرتے ہوئے)۔ سلام! میجر صاحب سلام!! آپ نے میری قربانی کو مسترد کر دیا۔ خیر۔ اب دعا ہے کہ شیو جی مہاراج، وشنو بھگوان، اور برہما جی آپ کی مدد کریں اور آپ کی بے غرضانہ کوششوں کو کامیاب بنائیں۔ (میجر کے جاتے ہی وہ شہ نشین کی طرف متوجہ ہوتی ہے) ہائے یہ آوازیں میرے دل میں کیسا ہنگامۂ بیم و رجا پیدا کر رہی ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

(باقی)

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ۸؍ عہ

منیجر نگار لکھنؤ

[1] ہو سکتا ہے کہ مصنف نے یہ ٹکڑا صرف "زیب داستان" کے لئے بڑھایا ہو۔ کیونکہ ہمارے پاس "جھانسی کی رانی" کی زندگی کی کوئی ایسی تفصیلی تاریخ موجود نہیں جس سے اس واقعہ کی تصدیق ہو سکے۔ (اڈیٹر)

مسئلہ آبادی اور ہندوستان

ضبطِ تولید پر عمل کرنا ناگزیر ہے

(مسئلہ آبادی)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا کی آبادی ہمیشہ سے بڑھتی ہی رہی ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ کہنا غلط ہے اگر ہم آبادی کے اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ صدیوں تک یکساں حالت رہی ہے صرف پچھلی صدی سے اس میں اضافہ ہوا ہے، یہاں تک کہ گزشتہ سو سال میں دُنیا کی آبادی نو ارب سے بڑھ کر اٹھارہ ارب ہوگئی ہے۔

اس کی وجہ زیادہ تر یہ خیال کی جاتی ہے کہ گزشتہ زمانہ میں وبائیں، جنگیں اور قحط وغیرہ زیادہ ہوتے تھے جو آبادی کے اکثر حصہ کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتے تھے لیکن اب سائنٹفک اور علمی اکتشافات اتنے ہوگئے ہیں کہ آبادی کے اس طرح گھٹنے کا زیادہ امکان نہیں رہا۔ بلکہ آسایش و آرام کا وافر سامان مہیا ہونے اور خوراک وغیرہ کی طرف سے نسبتاً زیادہ مطمئن ہو جانے سے اس کے بڑھنے کا زیادہ امکان ہے؟

اس حالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ آیا ہماری مادی اور اقتصادی حالت اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی ہے یا آیندہ چلکر ہمارے ذرائع ایک معتدبہ حصۂ آبادی کو خوراک بہم پہونچانے سے انکار کر دیں گے؟ یہ سوال یوروپ میں آج کل زیرِ بحث ہے اور ہندوستان میں بھی اس کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ مغربی مفکرین نے اُنیسویں صدی کے صنعتی و تجارتی انقلاب کے زمانہ سے ہی اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں مالتھس نے ایک نظریہ قائم کیا جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے چوٹی کا مسئلہ شمار ہوتا ہے۔

(مالتھس کا نظریہ)

مالتھس نے آبادی کی رفتار اور سامان خورد و نوش کا بغور مطالعہ کر کے یہ نظریہ قایم کیا کہ اگر رفتارِ پیدائش کا یہی حال رہا تو ایک زمانہ ایسا آئے گا جب آبادی کا اکثر حصہ سامان خورد و نوش سے بالکل محروم رہیگا۔ اگر آجکل کی

رفتار پیدائش کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا ایک جوڑا ایک ہزار سات سو پچاس برس میں دنیا کی موجودہ آبادی کے برابر بچے پیدا کر سکنے پر قادر ہے۔ لیکن خوراک کا اسی نسبت سے ترقی پانا قریباً ناممکن ہے کیونکہ قدرت اس باب میں اتنی فیاض نہیں، چنانچہ اسی خیال کے ماتحت مالتھس نے مجملاً اپنی تھیوری کو یوں بیان کیا کہ:- "اگر آبادی اقلیدس کی نسبت سے ترقی پاتی ہے تو خوراک ریاضی کی نسبت سے بڑھتی ہے"۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اگر آبادی ۲-۴-۸-۱۶-۳۲-- کی نسبت سے بڑھتی ہے تو خوراک کی نسبت اُس کے مقابلہ میں صرف ۱-۲-۳-۴-۵ ہے۔ گویا خوراک کے لئے آبادی کے قدم بقدم چلنا سخت دشوار ہے اور ایک ایسا وقت آنا ضروری ہے جب اکثر حصۂ آبادی بغیر سامان خورد ونوش کے رہجائے گا یا اگر ایسا نہیں تو بقیہ حصۂ آبادی کو اپنا معیارِ زندگی بہت پست کرنا پڑے گا تاکہ اس محروم شدہ حصۂ آبادی کا پیٹ پل سکے۔

(زائد از ضرورت آبادی کی نشانیاں)

اب سوال یہ ہے کہ یہ منزل ہندوستان کی معاشی زندگی میں آچکی ہے یا اُس کو آنا ہے یا آنے کا احتمال ہے؟ اس کے لئے ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ زائد از ضرورت آبادی کی نشانیاں کیا ہیں؟ یعنی وہ کیا حالات ہیں جن کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ملک اس منزل پر آچکا ہے؟

(۱)- ایک علامت تو یہ ہے کہ رفتارِ پیدائش اور رفتارِ اموات دونوں زیادہ ہوں خصوصاً بچوں کی اموات۔ آبادی بڑھ رہی ہے اور اُس کے مقابلہ میں سامان خورد ونوش کے بڑھنے کا کوئی زیادہ احتمال نہ ہو اور رفتار اموات اسلئے کہ لوگ اپنی اقتصادی حالت کے آخری نقطہ پر قائم ہیں اور وہ مزید آبادی کے لئے گنجائش نہیں نکال سکتے۔

(۲)- دوسری علامت یہ ہے کہ لوگوں کی آمدنی کم ہو اور آبادی بڑھ رہی ہو۔

(۳)- تیسری علامت یہ ہے کہ آبادی خود اختیاری روک کی بجائے قدرتی موانع کی وجہ سے کم ہو رہی ہو یعنی آبادی کو ایک حد کے اندر لانے میں برتھ کنٹرول کی بجائے قدرتی ذرائع از قسم وبا اور جنگ وغیرہ کارفرما ہوں کیونکہ صرف آبادی کو ایک خاص حد تک محدود کرنا ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ اُس کی قوت عمل کو بھی ایک خاص معیار تک قائم رکھنا ضروری ہے، قدرت کے طریق کار عجیب ہیں۔ کیونکہ وہ تو آبادی کے ایک بیشتر حصہ کو خس وخاشاک کی مانند بہا کرلے جاتی ہے لیکن اُس کا اثر باقی ماندہ آبادی پر نہایت خوفناک ہوتا ہے۔ مثلاً بہار میں شدید زلزلہ آیا اور آبادی گھٹ گئی لیکن اُس کے اثرات کتنے بُرے ثابت ہوئے۔ زمین کاشتکاری کے ناقابل ہوگئی۔ کارخانے تباہ ہوگئے ہزاروں عمارتیں منہدم ہوگئیں گویا کروڑوں روپیہ کا سرمایہ اور محنت بالکل ضائع گئی اور اب اُسی حالت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہے۔ علاوہ اس کے لوگوں کے حوصلے پست ہوگئے اور اب وہ نئے سرے سے اُنھیں کاموں کو دوبارہ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ پس قدرت کے طریق کار سے لوگوں کی محنت برباد ہوجاتی ہے

اور وہ حوصلہ شکنی کے ایسے قعر میں گر پڑتے ہیں کہ ملک کی اقتصادی ترقی ہونی محال ہے۔

(رفتارِ اموات و پیدائش)

اب اگر ہندوستان کو ان اُصول کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک میں زائد از ضرورت آبادی پائی جاتی ہے۔ پہلے رفتارِ پیدائش و اموات کو دیکھئے:- ہندوستان کی اوسط پیدائش ۱۹۱۱ء میں ۳۸ فی ہزار تھی اور ۱۹۲۰ء میں ۳۲ فی ہزار۔ اسی طرح رفتار اموات ۱۹۱۱ء میں ۳۰ فی ہزار ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں ۳۱ فی ہزار کے قریب۔ درانحالیکہ عام حالات میں کسی ملک کی رفتارِ پیدائش و اموات ۱۸ھ اور ۱۵ فی ہزار سے زائد نہیں ہونی چاہئے (یہ ماہرینِ اقتصادیات کا اندازہ ہے) اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری رفتارِ پیدائش تو معیاری رفتار سے چنداں بلند نہیں لیکن رفتارِ اموات بہت زیادہ ہے۔ جو ثبوت ہے اس بات کا کہ غربت کی وجہ سے ہمارا ملک مزید آبادی کو اپنے اندر جگہ دینے سے قاصر ہے۔ اگر ان اعداد و شمار کا دیگر ممالک کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان اس بارہ میں نہایت تیرہ بخت واقع ہوا ہے۔ مثلاً انگلستان کی رفتارِ پیدائش و اموات ۱۹۲۶ء میں صرف ۱۷ اور ۱۱ تھی۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ ہندوستان کی غربت اور آبادی کا کیا حال ہے۔ یہاں ہزاروں بچے روزانہ پیدا ہوتے ہیں اور ہزاروں ہی مرجاتے ہیں کیونکہ بوجہ غربت اُن کی غور و پرداخت نہیں ہوسکتی اور ہو بھی کیسے؟ ملک میں لاکھوں ایسے اشخاص پہلے سے ہی موجود ہیں جن کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ دوسروں کو کھلا سکیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہزار کے پیچھے دو تین سو بچے ہر سال فنا ہو جاتے ہیں جس کی کچھ وجہ تو صغر سنی کی شادی ہے جس سے بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں اور وہ ذرا سی بے پرواہی سے مرجاتے ہیں۔ اسکی اصلاح میں غربت و جہالت سدِّ راہ ہیں۔ الغرض ہمارے ملک کی رفتارِ پیدائش و اموات دونوں زیادہ ہیں اور خصوصاً بچوں کی اموات تو بہت زیادہ ہیں اور جس ملک کے یہ حالات ہوں وہ زائد از ضرورت آبادی کا حامل ہوا کرتا ہے۔

(ہندوستان کی فی کس آمدنی)

دوسری نشانی ہم نے یہ بتائی تھی کہ فی کس آمدنی کا اوسط کم ہو اور آبادی بڑھ رہی ہو۔ اس بارہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان غیر ضروری طور پر آباد ہے

(خود اختیاری رکاوٹیں)

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آبادی خود اختیاری روک کی وجہ سے کم ہو رہی ہے یا قدرتی موانع کی وجہ سے اول تو ہندوستان کی آبادی ایک حیرت انگیز رفتار سے بڑھ رہی ہے لیکن اگر کسی حد تک گھٹ بھی رہی ہے

تو اس کی وجہ خود اختیاری روک نہیں بلکہ قدرتی ذرائع ہیں۔ اب ہم چند خود اختیاری موانع کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُن کا اثر آبادی کے گھٹانے پر کس حد تک پڑتا ہے:۔

۱۔ قوتِ تولید

ہندوستان کی عورتوں کی قوتِ تولید دوسرے ممالک کے مقابلہ میں نہایت کم ہے۔ اعداد و شمار کی رو سے اگر ولایتی عورتوں کی قوتِ تولید ۱۹۶ فی ہزار ہے تو ہندوستانی عورتوں کی صرف ۱۶۰ فی ہزار۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بحیثیت مجموعی ہماری عورتیں دیگر ممالک سے کم بچے پیدا کرتی ہیں کیونکہ یہاں بچے پیدا کرنے والی عورتیں بہ نسبت دیگر ممالک کے زیادہ ہیں۔ اس لئے ہماری عورتوں کی کم قوتِ تولید کی وجہ سے آبادی کے گھٹنے پر کوئی معتد بہ اثر نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ بعض اوقات اتفاقیہ یا خود اختیاری طور پر بھی قوتِ تولید یا رفتارِ پیدائش کم ہو جاتی ہے مثلاً اگر شوہر بارش وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے سفر پر چلا جائے یا کسی بیماری کے سبب بیوی کے ساتھ مباشرت نہ کر سکے تو آبادی کے گھٹنے کا احتمال ہے۔ اسی طرح طبقہ اعلیٰ یا اوسط میں اب اسقاط حمل وغیرہ کا خیال پیدا ہو رہا ہے لیکن یہ دونوں باتیں اسقدر کم اثر رکھتی ہیں اور اسقدر گاہے گاہے معرضِ عمل میں آتی ہیں کہ ان کا ملک کی آبادی پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑتا

۲۔ معاشری رسوم

ہندوستان میں بعض معاشری رسوم ہیں جن کی وجہ سے آبادی کے گھٹنے کا احتمال ہے لیکن افسوس ہے کہ اُن کا بھی زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً عرصہ تک دودھ پلانا۔ ہندو مذہب کی رو سے بعض آدمیوں کیلئے شادی نہ کرنے کا حکم یا برہمچاریہ اور سنیاس کی تعلیم۔ اور ایک سے زیادہ شوہر یا بیویاں کرنے کی اجازت یہ ایسی باتیں تھیں جو آبادی کو زیادہ بڑھنے نہ دیتیں، لیکن اس کے مقابلہ میں ہندو و مسلم دونوں مذہبوں میں ہر شخص کو شادی ضرور کرنی چاہئے اس لئے طوعاً و کرہاً ہر شخص شادی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے متذکرۃ الصدر باتوں کا اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔ پس معاشری رسوم کی وجہ سے بھی آبادی کم نہیں ہوتی۔

۳۔ برتھ کنٹرول

آبادی کے بڑھنے میں تیسری خود اختیاری رکاوٹ یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ اپنے نفس پر ضبط کر کے کم بچے پیدا کریں اور صرف اُسی وقت بچے پیدا کریں جب اُن کو یقین ہو کہ اُن کی خاطر خواہ تربیت کرنے کا بھی سامان مہیا ہو سکے گا، مگر افسوس ہے کہ یہ احساس بھی ابھی ہمارے ہندوستانیوں میں نہیں ہے۔ برتھ کنٹرول کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ دیر کے بعد شادی کی جائے لیکن اس کے برخلاف ہمارے

ملک میں صغرسنی کی شادی کا رواج ہے جو ہماری آبادی کو ایک حد کے اندر رکھنے کے منافی ہے۔

الغرض ہمارے ملک میں خود اختیاری رکاوٹوں کی وجہ سے آبادی نہیں گھٹتی بلکہ قدرتی قوتیں اسکے کم کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ مثلاً عام طور پر ہر بیس سال کے بعد ہمارے ملک میں کوئی نہ کوئی آفت یا وبا ضرور آجاتی ہے جس سے آبادی کا اکثر حصہ راہیِ عدم ہوجاتا ہے۔ پھر ہماری زراعت زیادہ تر بارش کے رحم پر موقوف ہے جو کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اور اس لئے آبادی کا اکثر حصہ غربت و افلاس میں مبتلا رہنے کی وجہ سے حوادث زمانہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

(رفتارِ پیدائش کی زیادتی)

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوتیں ہیں جو ہماری رفتارِ پیدائش کو بے پناہ طور پر بڑھانے میں ممد و معاون ہیں؟ — صاف ظاہر ہے کہ رفتارِ پیدائش رفتارِ شادی پر منحصر ہوتی ہے۔ اور رفتار شادی ہمارے ملک میں بمقابلہ دیگر ممالک خاص طور پر زیادہ ہے۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے مذاہب اس کی پرزور تلقین کرتے ہیں مثلاً ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ "ہر شخص کو ضرور شادی کرنی چاہئے تاکہ اس سے کوئی لڑکا پیدا ہو جو اس کا کریا کرم کرسکے ورنہ مرحوم کی روح بے چین پھرے گی" (ہندوستان کے مسائل آبادی مصنفہ پی۔ کے وٹل)۔ مسلمانوں کا بھی عقیدہ ہے کہ "لا رہبانیۃ فی الاسلام" اسلام میں رہبانیت منع ہے۔

مذہبی تلقین کے علاوہ معاشری رسوم بھی اس بارہ میں ممد و معاون ہیں مثلاً اشتراکِ خاندانی جسکی وجہ سے لوگ بچے پیدا کرنے پر دلیر ہوجاتے ہیں کیونکہ اُن کو یقین ہوتا ہے کہ سب بچے اور بیوائیں یکجا پلتے رہیں گے۔ اور کسی ایک شخص پر چنداں بوجھ نہ پڑے گا۔ پھر ایک دوسرے کے طعنوں سے بچنے کے لئے لڑکیوں کی شادی جلد کردی جاتی ہے اور اس سے بھی آبادی کے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ غربت کی وجہ سے لوگ اس خیال سے بھی بچے پیدا کرتے ہیں کہ ہمارے بچے ہوں اور اُن کو کسی کام سے لگایا جائے تاکہ ہماری آمدنی میں اضافہ ہو۔

یہ سب قوتیں ہیں جو آبادی کے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں لیکن دیگر ممالک میں ان میں سے ایک بھی کارفرما نہیں ہے۔

(سامان خورد و نوش)

ایک طرف تو آبادی کا یہ بے پناہ طوفان ہے اور دوسری طرف خوراک کی پیداوار امید افزا نہیں، اور نہ اُس کے یکساں طور پر تقسیم کا کوئی انتظام ہے۔ ہمارا ملک زیادہ تر زرعی علاقہ ہے اور زراعت کوئی منفعت بخش پیشہ نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ زراعتی زمینوں پر اپنا سرمایہ اور محنت دوگنا کردیں تو آپ کو دوگنی پیداوار حاصل نہیں ہوگی برخلاف اس کے دوسری تجارتوں میں سرمایہ کی زیادتی اسی

نسبت بلکہ اس سے زیادہ آمدنی کا باعث ہوا کرتی ہے - اور اسی لئے کسی ملک کا صرف زراعت پر انحصار رکھنا سخت خطرناک ہے -

پھر ہماری زراعت بھی قدیم طریقوں پر کی جاتی ہے جس سے کسی نسبتی افادہ کی امید رکھنا عبث ہے - ہماری زمینیں قوانینِ وراثت وغیرہ کی وجہ سے جکڑی پڑی ہیں اور بہت سے حصوں میں بٹی ہوئی ہیں، جن کی وجہ سے نہ اُن پر ترقی یافتہ تجربے ہو سکتے ہیں اور نہ اکتشافاتِ عصریہ کے مطابق فلاحت کیجا سکتی ہے - پس آبادی کی نسبت خوراک بہت کم بڑھی ہے اور جو بڑھی بھی ہے وہ یکساں طور پر سب لوگوں میں تقسیم نہیں ہوتی - کیونکہ بوجہ غربت کے لوگوں کی قوتِ خرید کم ہے اور ہر شخص سامان خورد و نوش خریدنے سے قاصر ہے -

(مسئلہ زیرِ بحث)

پس ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو آبادی اپنے تمام ہولناک نتائج کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف خوراک اپنی تعداد اور یکسانیت کے لحاظ سے کم ہو رہی ہے جس کا اثر موجودہ آبادی پر نہایت خوفناک طریق سے پڑ رہا ہے - اگر ہم کو زندہ رہنا ہے اور مہذب ممالک میں شمار ہونا ہے اور دوسری قوموں کے دوش بدوش ترقی کرنا ہے تو ہمیں وہ کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جو ہماری آبادی کو گھٹا دیں اور ہماری خوراک کو زیادہ سے زیادہ اور یکساں طریق پر لوگوں کے درمیان تقسیم کرنے میں ممد ثابت ہوں، تاکہ ہماری حسنِ کارکردگی بڑھے اور ہم اقتصادی اور سیاسی طور پر مضبوط ہوں ؟

پہلے ہم اُن ذرائع کو لیتے ہیں جن سے ہمارا سامانِ خورد و نوش بڑھ سکتا ہے اور اُس کو مناسب طور پر تقسیم کرنے کے لئے لوگوں کی قوتِ خرید بھی بڑھائی جا سکتی ہے -

۱- زرعی ترقی

میں نے بتایا ہے کہ ہمارا ملک زیادہ تر زراعتی ہے لیکن اُسکو فروغ دینے کے لئے موثر تدابیر اختیار نہیں کی گئیں - اول تو ہماری کاشتکاری کے ذرائع بہت قدیم ہیں، اور اکتشافاتِ عصریہ کو استعمال نہیں کیا جاتا، اگر اس طرف توجہ کی جائے تو بہت کچھ ترقی کی اُمید ہو سکتی ہے - پھر اس کے ساتھ دیہاتی قرضہ - منڈی کی تنظیم اور رسل و رسایل کے مسائل بھی حل کئے جائیں اور امداد باہمی کے لئے ملک میں بنک جاری کئے جائیں -

۲- صنعتی ترقی

زراعتی اور صنعتی ترقی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے - اگر زراعت ترقی یافتہ ہو تو صنعت خود بخود ترقی کرے گی کیونکہ کارخانوں میں خام اجناس وغیرہ ہی کا استعمال ہوتا ہے - دوسرے لوگوں کی آمدنیاں بڑھانے

کے لئے ضروری ہے کہ صنعتیں جاری کی جائیں کیونکہ جن لوگوں کو زراعت اپنے اندر سمیٹنے کے لئے تیار نہیں وہ صنعت وحرفت کے ذریعہ سے اپنا پیٹ پال سکتے ہیں پھر اگر لوگوں کی آمدنیاں زیادہ ہوجائیں گی تو وہ ہندوستان کی زرعی اور صنعتی اشیاء کے لئے نفع بخش منڈیاں بھی بن سکیں گی ورنہ آج کل تو کارخانہ والوں کو یہی شکایت ہے کہ اُن کی اشیاء نہیں بکتیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ لوگوں کی قوت خرید کم ہے اگر صنعتیں جاری ہوں گی تو جب لوگوں کی زراعت بوجہ کمی بارش وغیرہ کے غیر مفید ہوگی تو وہ اس طرف آکر سُکھ پائیں گے پس ملک میں کارخانے جاری کرنے ہر طرح سے مفید ہیں اور گورنمنٹ کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو صنعت کی طرف مائل کرنے کیلئے اُن کو ہر طرح کی مراعات عطا کرے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرے۔

(آبادی گھٹانے کے وسائل)

اس کے بعد ہم آبادی کو گھٹانے کے وسائل درج کرتے ہیں :۔

۳۔ غیر ملکی ہجرت

دنیا کی تمام چیزوں میں سے انسان کو منتقل کرنا بہت دشوار قرار دیا گیا ہے خصوصیت کے ساتھ اہل ہند کو وہ شروع سے ہی ہجرت کے خلاف ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہندوستانی گھریلو لوگ ہیں اور وہ اپنے ملک کیا اپنے گاؤں سے باہر بھی قدم رکھنا بدشگونی خیال کرتے ہیں۔ لیکن اب تعلیم اور واقفیت پھیلنے کی وجہ سے لوگ غیر ملکوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں اور اسوقت تیئیس۲۳ لاکھ کے قریب ہمارے ہندوستانی غیر ملکوں میں موجود ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ برطانوی سلطنت کی بعض نوآبادیوں نے ہندوستانیوں کی آمد کے خلاف قوانین نافذ کر دئے ہیں اور اب ہم لوگ وہاں جانے کے مجاز نہیں۔ تاہم سلطنت برطانیہ کے بعض دیگر مقامات ہماری آبادی کو خیر مقدم کہنے کے لئے تیار ہیں مثلاً "گیانا" جو اپنی موجودہ آبادی سے دس گنا زائد آبادی اپنے اندر سمیٹنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ قانونِ ہجرت ۱۹۲۲ء کی رو سے وہاں ہندوستانیوں کو جانے کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن ابھی اُس کا اطلاق عملی صورت میں نہیں ہوا کیونکہ نوآبادی کے سرمایہ داروں کو اُس کی بعض شرائط سے اختلاف تھا تاہم یہ اسکیم ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اسی طرح بعض جزائر میں جانے کے لئے ابھی بہت گنجائش ہے۔

۴۔ صوبجاتی انتقالِ آبادی

۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہماری آبادی کا دس فیصدی حصہ (یعنی تقریباً تین کروڑ) اپنے شہروں اور ضلعوں کے باہر پایا گیا لیکن ان تین کروڑ میں سے دو کروڑ ایسے تھے جو اپنے ضلع کے نہایت ہی قریب کے علاقہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ معاشرتی بندھنوں اور زبان کی مشکلات وغیرہ کی وجہ سے بھی لوگ صوبجاتی انتقالِ آبادی نہیں کرسکے۔ تاہم بنگال برہما اور بمبئی میں دیگر صوبجات کے لوگ بکثرت موجود ہیں اور اُن پر سوائے برہما کے

کسی قسم کی قیود یا پابندیاں عائد نہیں کی گئیں۔ اگر بعض صوبجات میں اقتصادی یا صنعتی ترقی ہو جائے تو اس طریق سے بھی آبادی کا بوجھ ہلکا ہونے کی بہت کچھ اُمید ہے۔

۵۔ ضبطِ تولید

ضبطِ تولید کا مسئلہ ابھی تک لوگوں نے پوری طرح نہیں سمجھا کیونکہ اُن میں سے اکثر حصہ اس کو اس طرح ٹالدیا کرتا ہی کہ ملک کے سامنے ابھی اقتصادی ترقی کے بے شمار ذرائع ہیں۔ اگر اُن کو موثر طریق پر استعمال کیا جائے تو آبادی کا مسئلہ خاطرخواہ طور پر حل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ "زائد از ضرورت آبادی" کے نہ سمجھنے یا ہندوستان کی جغرافیہ نہ جاننے کی وجہ سے ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے ملک کے ذرائع آمدنی بہت محدود ہیں اور آبادی کے لحاظ سے نہ زراعت کافی ہے نہ صنعت و حرفت اس لئے اس لحاظ سے کسی اقتصادی ترقی کی امید رکھنا عبث ہے۔

"زائد از ضرورت" آبادی کا صرف یہ مفہوم نہیں کہ آبادی کے بالمقابل خوراک کی تعداد کم ہے بلکہ یہ کہ موجودہ آبادی بھی کمزور پیدا ہو رہی ہے اور غربت اور جہالت کی وجہ سے اُس کی کارکردگی بالکل مفقود ہے جب یہ حالت کسی قوم میں پہونچ جائے تو اُس کو جلد سے جلد اپنی فکر کرنی چاہئے اور جلد سے جلد آبادی کے روک تھام کی تدابیر عمل میں لانی چاہئے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اقتصادی ترقی الہ دین کے چراغ کی طرح کسی منتر یا جھاڑ پھونک کے ذریعہ یک لمحہ معرضِ ظہور میں نہیں آجائے گی بلکہ اُس کو پنپنے میں کافی دیر لگے گی اور اس اثنا میں ہمیں بعض دیگر تجاویز کے متعلق لائحہ عمل بنانا ہوگا۔

ضبطِ تولید کے حق میں فیصلہ کر لینا اس قدر مشکل نہیں جتنا کہ وسیلہ تلاش کرنا ہے یعنی ضبطِ تولید کس ذریعہ سے کی جائے؟ پرانا طریق یہ تھا کہ حمل گرا دیا جاتا تھا یا لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے لیکن اب قانون اور سوسائٹی دونوں نے ان طریقوں کو مذموم اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے اس لئے یہ متروک ہو گئے ہیں۔

ولایت اور دیگر ملکوں میں مانعِ حمل مصنوعی طریق مروج ہیں لیکن یہ خطرہ سے خالی نہیں مثلاً ان کی وجہ سے مرد عورت دونوں میں احساس ذمہ داری مٹ جاتا ہے اور وہ صنفی بے احتیاطیوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جس سے کھانسی۔ تپ دق۔ بخار۔ یرقان اور دیگر بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ان سے جثہ بھی کمزور ہو جاتا ہے جو بالآخر قومی دولت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ضبط تولید کس طریق سے کیجائے؟ میرے خیال میں اسکی تدبیر صرف یہ ہے کہ لوگوں میں پروپگنڈا کیا جائے اور اُن کو مسئلہ آبادی وغیرہ کے نظرئے واضح کر دئے جائیں اور اُن کو سمجھایا جائے کہ کسی ذی روح کو پیدا کر کے مناسب تعلیم و تربیت نہ دینا ہلاکت کے مترادف ہے۔ میں نسل انسانی کے خلاف نہیں ہوں اور نہ شادی کے خلاف تلقین کر رہا ہوں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ غربا جن کی آمدنیاں دس پندرہ روپیہ سے زیادہ نہیں وہ ایک سے زیادہ شادی نہ کریں اور وہ بھی کافی عمر گزر جانے کے بعد کریں، اور پھر

اگر بچہ پیدا کرنے کا خیال ہو تو یہ دیکھ لیں کہ صرف اُتنے پاؤں پھیلانے چاہئیں جتنی چادر ہو۔

آخر کیا وجہ ہے کہ غربا اور جاہل آدمیوں کے بچے بہ نسبت امرا اور تعلیم یافتہ طبقہ کے زیادہ ہوتے ہیں؟ محض اس لئے کہ اُن کو سوائے بیوی بچوں کے کوئی اور سامانِ تعیش میسر نہیں ہوتا جس سے وہ اپنا دل بہلا سکیں۔ پُرانے زمانے میں سنیما۔ سرکس، کھیلیں اور سیر وغیرہ کرنے کے اس قسم کے سامان نہ ہوتے تھے جس قسم کے آجکل ہیں اس لئے اُن کا منبع مسرت سوائے بیوی بچوں کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب چونکہ مسرت حاصل کرنے کے نئے نئے طریق نکل چکے ہیں اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ بیوی کو کیوں صرف آلۂ تولید یا بچے پیدا کرنے کی مشین قرار دیا جائے اور کیوں نہ اُس سے زیادہ منفعت بخش اور گوناگوں کام کرنے کی اُمید رکھی جائے۔

مجھے تو حساب کے ایک سادہ سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکا اور میں نے اُس کو ہمیشہ غربا کے طبقہ کے سامنے رکھا۔ کہ اگر آپ کی آمدنی دس روپئے ہے تو آپ اُس کو اکیلے کھا رہے ہیں اور اُس کی مدد سے آپ نے ایک خاص معیارِ زندگی مقرر کر لیا ہے۔ لیکن، اگر شادی کر لی جائے تو آمدنی لازمی طور پر دو آدمیوں کے درمیان تقسیم ہو جائے گی جس سے آپ کو اپنا معیارِ زندگی کم کرنا پڑے گا اور چونکہ وہ پہلے ہی بہت کم تھا اس لئے لازماً اُس کا اثر حسنِ کارکردگی پر پڑے گا اور بہت ممکن ہے کہ آپ کی آمدنی دس روپیہ کی بجائے آٹھ یا نو روپیہ رہ جائے اسی طرح اگر ایک بچہ پیدا ہو جائے تو اور بھی زیادہ مصیبت واقع ہو جائے گی۔

اگر ایک امیر آدمی شادی کرے تو اُس کی اقتصادی زندگی پر چنداں اثر نہیں پڑے گا کیونکہ اس کا معیار زندگی اسقدر بلند ہے کہ اگر وہ اس کو گھٹائے تو حسنِ کارکردگی پر زیادہ اثر انداز نہ ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص دو تین سالن نہ کھائے یا دس سوٹوں کی بجائے صرف چھ سوٹ پہنے تو اُس کی حسنِ کارکردگی وہی رہے گی۔ پس شادی موجودہ حالات میں غریبوں کے لئے جائز نہیں ہو سکتی البتہ اگر وہ کریں تو بچے تین چار بلکہ زیادہ سال کے وقفہ کے بعد پیدا کریں اس سے اُن کے نامۂ اعمال میں کسی قسم کا کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ باقی رہا بقائے نسل کا سوال۔ اُس کے لئے اول تو کوئی ٹھوس دلیل نہیں، تاہم اگر اس کو لازم ہی قرار دیا جائے تو ایک دو بچے کافی ہیں۔

شادی کرنی چاہئے اور ضرور کرنی چاہئے لیکن کسی چیز کا ناجائز استعمال درست نہیں ہے۔ قرآن نے انسان کی بیوی کو کھیتوں سے تشبیہ دی ہے۔ جتنا بھی زیادہ بیج ڈالو گے اُتنے ہی کمزور اور جلد مرجھانے والے پودے پیدا ہوں گے پس زیادہ اولاد پیدا کرنا کوئی صفت نہیں ہے ۔۔۔ آج کل فرانس اور جرمنی اپنی آبادی بڑھانے کی فکر میں ہے اور جرمنی والے تو زیادہ بچے پیدا کرنے والے ماں باپ کو وظیفے اور دیگر قسم کی مراعات دیتے ہیں لیکن انکا مقصد سیاسی طاقت اور اقتدار ہے، ہمیں زیادہ انسانوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اُن کی باطنی خوبیاں درکار ہیں جو اُن کو قومی پیداوار کے بڑھانے کی طرف مائل کریں۔

عبدالرحیم شبلی بی، کام

بچّہ

کھانے کے بعد ایک اسقاطِ حمل کا ذکر ہو رہا تھا جو حال ہی میں ہوا تھا۔ خاتون نے تیوری چڑھا کر کہا:۔
یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قصائی کے لڑکے سے تعلق رکھنے والی لڑکی اپنے بچے کو ایک کھائی میں پھینکدے! کسقدر وحشت انگیز، کس قدر تکلیف دہ واقعہ ہے!"

ڈاکٹر جو شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھانے والا تھا نہایت استقلال و خاموشی سے اس واقعہ کی تمام جزئیات کا ذکر کر رہا تھا کبھی وہ بدقسمت ماں کی جرأت پر تعجب کرتا جس نے تنہا اس بچے کو جنا اور اس کے بعد اس کو ہلاک کر کے تقریباً دو میل پیدل چلی گئی۔ اس نے کہا کہ "رات کے سناٹے میں اپنے بچے کو لیکر جنگل میں جانا کتنا سخت کام ہے! ذرا اُس کی روح کی دہشت اور قلب کی اذیت کا خیال کیجئے! اُف، زندگی کتنی حقیر کتنی قابل نفرت ہے! مکروہ تعصب ہے، ہاں مکروہ تعصب، ارتکاب جرم سے بدتر پاس عزت کا جھوٹا خیال، مصنوعی احساسات کا ایک پورا لشکر، نفرت انگیز آبرو اور رقت انگیز شرافت ـــ یہی وہ اسباب ہیں جو ایسی حرکتوں پر عورت کو مجبور کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "انسانوں کے فطری اتحاد کو جرم بنا دینا نوع انسان کے لئے باعث شرم ہے!"

خاتون غصہ سے سرخ ہو گئی۔ "تو ڈاکٹر تم بدی کو نیکی پر ترجیح دیتے ہو۔ ایک فاحشہ کو باعصمت عورت سے افضل سمجھتے ہو!

ڈاکٹر جس نے اپنے پیشے کے سلسلے میں بے شمار "زخم ہائے حیات" دیکھے تھے اُٹھ کھڑا ہوا اور زور دیکر کہنے لگا:۔ "آپ بحث کر رہی ہیں اُن باتوں پر جن سے آپ ناواقف ہیں کیونکہ آپ کو کبھی غیر مغلوب نفسانی خواہش پیدا ہی نہیں ہوئی۔ بدقسمت دراصل وہ لوگ ہیں جن کو دغاباز فطرت نے قوی خواہشات عنایت کی ہیں۔ خاموش آدمی جو بغیر قوی احساسات کے پیدا ہوئے ہوں اُن کے لئے نیک رہنا کوئی مشکل نہیں۔ مشکل اُن کے لئے ہے جن کے جذبات طوفانی سمندر کی طرح ناقابل ضبط ہیں۔ ـــ وہ عورتیں جو بدنام نہیں، وہ ہیں جن کی طبیعت میں یہ جوش نہیں ہے اور میں اُن کی عصمت و شرافت کو لائقِ تحسین نہیں سمجھتا کیونکہ اُن کو کسی طاقت کا مقابلہ ہی کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ روس کی کیتھرائنیں اور امیرزادیاں کبھی باعصمت و شریف نہیں رہ سکتیں۔ اُن کے لئے باعصمت رہنا ناممکن ہے۔

وہ پیدا ہوئی ہیں پیار کئے جانے کے لئے۔ اُن کے اعضا مختلف ہوتے ہیں، اُن کا گوشت دوسرا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ کسی دوسرے جسم کا اتصال اُن میں بہت جلد شوریدگی پیدا کر دیتا ہے۔ اُن کی رگ رگ ترغیب دیتی ہے، پریشان کرتی ہے اور بالآخر اُن کو مغلوب کر لیتی ہے جبکہ آپ کو اُس کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔ اچھا آپ ایک باز کو پالئے اور اُس کو وہی بیج کھلائیے جو آپ ایک طوطے کو دیا کرتی ہیں! اگرچہ دونوں پرندے ہیں اور دونوں کی چونچیں مُڑی ہوئی ہیں لیکن اُن کے خصائل مختلف نظر آئیں گے۔

کاش آپ کو صرف احساسات کی طاقت کا اندازہ ہوتا کہ کس طرح وہ رات، رات بھر آگ میں جلاتے رہتے ہیں۔ جسم بھُن رہا ہے، دل دھڑک رہا ہے اور دماغ عجیب قسم کی اذیت کا شکار ہے۔ ایک واقعہ سنئیے۔

"ایک عورت جس کو میں میلیتی کے نام سے موسوم کروں گا اُس وقت سے جبکہ وہ بچہ ہی تھی شہوانی جذبات کی حامل تھی۔ اُس کے احساسات اُسی وقت بیدار ہو چکے تھے جبکہ وہ باتیں کرنا سیکھ رہی تھی۔ جب وہ بارہ سال کی تھی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پوری عورت ہے اور خواہشات شہوانی نے اُس کو مستقل طور پر پریشان کر رکھا ہے۔ اس امر کی گواہی اُس کا چہرہ دے رہا تھا۔ اُس کے خفیف سے اُبھرے ہوئے گداز، قوی گردن، نرم جسم، لانبی ناک، چوڑے نتھنے، بڑی بڑی سُرمگیں آنکھیں! کون اس کے پُر جوش خون کو ٹھنڈا کر سکتا تھا؟ وہ ساری رات رو کر گزار دیتی۔ بالآخر جب وہ پندرہ برس کی ہو گئی تو اُس کے والدین نے شادی کر دی۔ دو برس بعد اُس کے شوہر کا دق سے خاتمہ ہو گیا۔ اسی کی بدولت وہ نحیف و کمزور ہو گیا تھا۔ اٹھارہ ماہ بعد دوسرے شوہر کا بھی یہی حشر ہوا تیسرے نے چار سال تک ساتھ دیا اور پھر اُس کو چھوڑ کر چلتا بنا۔ یہ بڑا سخت زمانہ تھا۔

جب وہ اکیلی رہ گئی تو اُس نے باعصمت رہنے کی کوشش کی۔ بہرحال ایک دن اُس نے مجھے بلوا بھیجا کہ اُس پر تشنج کے دورے پڑ رہے ہیں اور وہ نہایت پریشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ بیوگی اُس کا خاتمہ کر دے گی چنانچہ میں نے اُس سے کہہ دیا کہ وہ کسی سے شادی کر لے۔ وہ ایک ذی عزت عورت تھی۔ باوجود شدید اذیتیں سہنے کے اُس نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ دیہاتی کہتے تھے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے رات کے وقت وہ دور دور کے چکر لگاتی تاکہ اُس کا جسم تھک کر چُور چُور ہو جائے۔ پھر وہ غش کھا کر گر پڑتی اور خوفناک تشنج کے دورے ہوا کرتے اپنی والدہ اور دیگر اعزہ کے مکان کے قریب وہ تن تنہا اپنے مکان میں رہا کرتی تھی۔ میں وقتاً فوقتاً اُسے دیکھنے جایا کرتا تھا اور حیران تھا کہ فطرت کی اٹل مرضی اور اُس کی اپنی ہٹ کا آخر انجام کیا ہو گا؟

ایک دفعہ شب کے آٹھ بجے جبکہ میں کھانا تقریباً ختم کر چکا تھا وہ میرے مکان پر آئی، اُس نے کہا:۔

"میں برباد ہو گئی ۔۔ میں حاملہ ہوں! ۔۔۔ یہ سنکر میں حیران رہ گیا"

اس کے بعد یکایک میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اُس نے اضطراب سے کہا:۔

"ڈاکٹر یہ حمل میرے پاس کے باغبان کا ہے۔ پارک میں ٹہلتے ہوئے مجھے غش آگیا۔ مجھے گرتا دیکھ کر وہ دوڑا ہوا آیا اور اندر لیجانے کے لئے اُس نے مجھے اپنے بازؤں میں سنبھال لیا، میں نے کیا کیا؟ مجھے خبر نہیں، تم میری شرمناک بیماری سے واقف ہو۔ اس طویل قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ میں گناہگار ہوں۔ میں زیادہ ضبط نہ کرسکتی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنی ہچکیوں کو روک کر بولی کہ "میں نے اسقاط حمل کی کوشش کی، کھولتے ہوئے پانی میں نہائی، گھوڑوں پر سواری کی جمناسٹک کی۔ دوائیں، شراب اور زعفران استعمال کی مگر لاحاصل۔ تم میرے والد اور بھائیوں کو جانتے ہو، میں برباد ہو گئی۔ میری بہن کی ایک ذی عزت شخص سے شادی ہو چکی ہے۔ میری بے عزتی کا اُن پر اثر پڑے گا۔ پھر ہمارے دوستوں، ہمسایوں اور نام کا خیال کرو۔ میری ماں......."

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اُس سے سوالات کرنے لگا۔ اس کے بعد میں نے اُس کو ایک طویل سفر پر چلے جانے کا مشورہ دیا تاکہ وضع حمل گھر سے دور ہو۔ اُس نے کہا:۔ "ہاں۔۔ ہاں...... بہت اچھا" پھر بغیر یہ سنے ہوئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں وہ چلی گئی۔

اُسے دیکھنے میں بارہا جاتا رہا۔ اُس کو جنون ہوتا جارہا تھا اُس بچے کے احساس نے جو اُس کے پیٹ میں پرورش پا رہا تھا، اُس کے دماغ پر ایک تیز تیر کا سا اثر کیا تھا۔ اُس کو ہمیشہ اُسی کا خیال لگا رہتا۔ دن میں نہ وہ باہر نکلتی اور نہ کسی سے ملتی تھی تاکہ کہیں اس قابل نفرت راز کا افشا نہ ہو جائے۔ روزانہ شب کو وہ آئینہ کے سامنے لباس اُتار کر اپنے شکم کی بدوضعی کرتی۔ پھر اپنے آپ کو خاک پر گرا دیتی اور اپنی چیخوں کو روکنے کے لئے منھ میں تولیہ ٹھونس لیتی۔ رات میں بیسیوں دفعہ وہ اپنے بستر سے کودتی، موم بتی روشن کرتی اور اُس بڑے آئینے کے سامنے واپس آجاتی جس میں اُس کے بدنما عریاں جسم کا عکس نظر آتا تھا۔ رنج و غصہ سے وہ اپنی ناف پر گھونسے مارتی تاکہ اُس بچہ کا خاتمہ ہو جائے جس سے خود اُس کی جان کا خطرہ تھا۔ دونوں کی لڑائی نہایت خوفناک تھی لیکن بچہ نہیں مرا۔ اُسکو کچل ڈالنے کے لئے وہ فرش پر لوٹتی اور سوتے وقت اپنے جسم پر پتھر رکھتی تاکہ اُس کا دم گھٹ جائے۔ وہ بچے سے ایسی نفرت کرتی تھی جیسے کوئی اپنے زبردست دشمن سے کرتا ہے۔

بچے سے اپنا پیچھا چھڑانے کی ان ناکام مشقتوں کے بعد ان غیر فطری کوششوں کے بعد وہ دیوانہ وار کھیتوں میں ماری ماری پھرتی۔ ایک دن صبح کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے پاؤں چشمے میں ڈالے ہوئے بیٹھی ہے اور آنکھوں میں ایک مجنونانہ چمک ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کو سرسام ہو گیا ہے لیکن وہ اصل حقیقت سے ناواقف تھے اس ملعون بچے کو اپنے جسم سے نکال پھینکنے کے خیال نے اُسکے دل و دماغ کو بیکار کر رکھا تھا۔

ایک مرتبہ شام کے وقت اُس کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا:۔ تم کیسی موٹی ہوتی جارہی ہو میلین۔ اگر تم شادی شدہ ہوتیں تو میں یہ سمجھتی کہ بچہ ہونے والا ہے۔

ان الفاظ سے اُس کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ فوراً وہاں سے اپنے گھر چلی آئی اور نیچے باورچی خانے میں جاکر الماری کھولی اور ایک بڑا چاقو نکالا۔ پھر دوبارہ بالاخانے پر گئی موم بتیوں کو روشن کیا اور آئینے کے روبرو ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اُس نے اُس مقام کو محسوس کیا جہاں بچہ حرکت کر رہا تھا اور پھر چاقو کی ایک ہی ضرب میں اپنا پیٹ اوپر سے نیچے تک چاک کر ڈالا۔

اُس نے اپنے دشمن کو پکڑ لیا جو ابتک اُس کی گرفت سے بچتا رہا تھا۔ اُس کی ٹانگ پکڑی اور چیر کر اُس کو آتشدان میں پھینکنا چاہا۔ لیکن وہ نال سے جُڑا ہوا تھا جس کو وہ کاٹ نہ سکی تھی۔ آخر کار اُس کا بھی دم نکل گیا اور خون میں ڈوبی ہوئے بچے کی نعش پر گر پڑی۔

پھر بتائیے کیا آپ اُس کو بڑی بدکار خیال کرتی ہیں؟"

ڈاکٹر خاموش ہو گیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن خاتون نے کوئی جواب نہ دیا۔

(موپاساں)

سید محمد احسن بی۔ اے حیدر آبادی

(نگار) موپاساں کے فسانے اکثر و بیشتر سوسائٹی کے ان مسایل سے متعلق ہوتے ہیں، جن کو دوسرے افسانہ نگار نفسیاتی نقطۂ نظر کی بجائے اخلاق کے اُصول کو سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں۔

موپاساں کسی جرم و معصیت کو سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین کی روشنی میں نہیں دیکھتا بلکہ وہ فطرت انسانی کے ماتحت اس کا مطالعہ کرتا ہے، اس لئے وہ ایک مجرم کو ہمیشہ رحم و عفو کے قابل سمجھتا ہے اور اس کی عقوبت و سزا کا موافق نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ فطرت قانون کے درمیان ہمیشہ جنگ جاری رہنا ہی ثبوت ہے اس امر کا کہ قانون، داعیات قدرت کے خلاف کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور جرم و معصیت حقیقتاً ایک بیماری ہے جس پر انسان کو قابو نہیں۔

اس فسانہ میں اس نے عورت اور اس کی خواہش نفسانی کو سامنے رکھ کر "عصمت و عفت" کا مفہوم متعین کرنا چاہا ہے اور بہ حالات موجودہ جبکہ عورت کی تعلیم و آزادی کا مسئلہ عام توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ غور کرنا ہر متمدن انسان کا فرض ہے۔

اس دورِ آزادی میں عورت کو سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ اگر مرد جذبۂ شہوانی سے مغلوب ہو کر کوئی نازیبا حرکت کر بیٹھتا ہے تو سوسائٹی اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور عورت اگر اسی کی مرتکب ہو تو اس کو بدترین مجرم جانکر سوسائٹی سے علحدہ کر دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے علمائے تمدن و اخلاق اس کی کوئی تاویل پیش کر سکیں، لیکن جس حد تک اُصول اور فطرت کا سوال ہے، اس کا کوئی قابل

اطمینان جواب مرد کے طرف سے نہیں دیا جاسکتا - موجودہ علماء نفسیات کا خیال ہے کہ دنیا میں جرم و معصیت کو مکروہ سمجھ کر سزا جسمانی سے اس کا علاج چاہنا سخت غلطی ہے اور اس غلطی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ باوجود قانون کی اس دار و گیر کے جرائم کی طرف انسان کا میلان بدستور قائم ہے -

گناہ ایک فطری مجبوری یا نفسیاتی بیماری ہے اور اس کا علاج بھی بالکل فطرتاً و نفسیات کے اُصول پر ہونا چاہئے نہ یہ کہ اظہار نفرت و بیزاری سے مجرم یا گناہگار میں جذبۂ انتقام پیدا کر کے اسکو اور زیادہ معصیت کی طرف مایل کیا جائے -

آجکل نگار میں کسبی کے موضوع پر جو اظہار خیال کیا جا رہا ہے اس کو اس فلسفۂ "جنایات" سے بڑا گہرا تعلق ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگ گفتگو کے وقت اس کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں اور صرف ان اصولِ اخلاق کو سامنے رکھتے ہیں، جو خود ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں اور یقیناً وقت و ماحول کے لحاظ سے بدلجانے والی چیزیں ہیں -

"حدیثِ حُسن"

مصور جذبات جناب فطرت واسطی کی ولولہ انگیز اور دلکش نظموں کا مجموعہ ہے جس کا ایک ایک شعر کیف جذبات میں ڈوبا ہوا، لطف زبان سے رنگین، حُسن تخیل سے مزین اور ندرت بیان میں معجز نما ہے اور جو عنقریب بہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر دلدادگان ادب کی دلبستگی کا باعث ہوگا -

حدیثِ حُسن

کے مصنف فطرت واسطی تقریب تعارف سے مستغنی ہیں، ارباب ذوق نگار، شاہکار، زمانہ اور دوسرے مشاہیر رسالوں میں آپ کی سحر اثر نظمیں بارہا دیکھ کر لطف اندوز ہوئے ہیں - اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں اس مجموعہ میں ملک کے دو ممتاز اور مایۂ ناز ادیبوں کے فاضلانہ مقدمات ہوں گے، پچاس نظمیں، اور دو تصاویر ہوں گی، بہترین کتابت، دیدہ زیب طباعت اور غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ شایع ہوگا -

باوجود ان محاسن صوری و معنوی کے

قیمت صرف عہ ر ہوگی تاکہ کم مایہ شائقین کا ذوق طلب بھی مجروح نہ ہو جائے - (نوٹ) ۱۵ر اگست ۳۵ء تک زر قیمت پیشگی ارسال کرنے والوں کی خدمت میں "حدیث حُسن" سب سے پہلے اور بلا محصول حاضر کیا جائیگا

المشتہر :- منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور - یو - پی

سوا سو سال قبل دکن کی شاعری

نواب بدر الدین خاں تمیز

خاندان شمس الامرا علم و فضل کے اعتبار سے دکن میں بہت ممتاز مرتبہ رکھتا ہے۔ نواب بدرالدین خاں بہادر رفعت جنگ معظم الدولہ معظم الملک اسی خاندان کے ایک فرد تھے اور شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے آپ کا مکمل (مطلا و مذہب) دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

اس خاندان کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ابوالخیر خاں (جن کا سلسلہ نسب حضرت شیخ فرید گنج شکر سے مل کر حضرت عمر پر ختم ہوتا ہے) شیخ بہاء الدین خاں کے فرزند تھے جو شکوہ آباد ضلع مین پوری کے باشندے تھے۔ عنفوانِ شباب میں محمد شاہ بادشاہ دہلی سے خان بہادر کا خطاب پایا اور آصف جاہ اول کے ساتھ دکن آئے اور دو ہزار اہوار منصب پانچسو سوار اور تیس ہزار یادہ کی جاگیر سے سرفراز ہوئے۔

نواب ناصر جنگ شہید جب اپنے والد آصف جاہ اول سے معرکہ آرا ہوئے تو ان کو بھی اپنا طرفدار بنانا چاہا مگر انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ باپ کے ملازم کے لئے اسوقت بیٹے کا ساتھ دینا جبکہ وہ باپ کا مخالف ہو سخت نمک حرامی ہے۔ ناصر جنگ کو اس سے سخت ملال ہوا اور انھوں نے تخت نشین ہونے کے بعد جاگیر ضبط کر لی مگر پھر بحال کر کے شمشیر بہادر کا خطاب دیا۔

نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ بہادر نے تخت نشین ہو کر ان کو برہان پور کی سندی اور نواب صلابت جنگ بہادر نے پالکی جھالردار اور "امام جنگ" خطاب مرحمت فرمایا۔

ابوالخیر خاں شمشیر بہادر امام جنگ نے ۲۶ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو بعارضہ فالج برہان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے آپ کے دو فرزند تھے ایک ابوالفتح خاں تیغ جنگ ابوالخیر خاں ثانی شمس الدولہ شمس الملک اول شمس الامرا بہادر، دوسرے شیخ ابوالبرکات خان بہادر امام جنگ محمد بہاء الدین خاں ثانی جنھوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں کسی جنگ میں زخمی ہو کر برہان پور میں انتقال کیا۔

ابوالفتح خاں اپنی جاگیر موضع لارشاگر میں رہا کرتے تھے رکن الدولہ کے انتقال کے بعد سرکار نے انھیں دیوان مقرر کرنا چاہا مگر انھوں نے انکار کردیا، پائگاہ کے ایک خاص رسالہ کے علاوہ بارہ ہزار فوج بھی تھی بر ۱۱۹۱ھ میں اصل کے علاوہ پنج ہزاری منصب، پانچ ہزار سوار، علم، نقارہ اور جھالردار پالکی، شمس الدولہ خطاب مرحمت ہوا۔

انھوں نے ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ کو پانگل کے مقام پر انتقال کیا اور حیدرآباد میں درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے مرحوم نے اپنے پسماندوں میں ایک فرزند محمد فخرالدین خاں شمس الامرا، امیر کبیر اول چھوڑا جو ۵ ارمضان ۱۱۹۵ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۹ھ میں بہاالدین خاں اور جنگی، دولائی، ملکی خطاب پایا اور پھر امام جنگ خورشیدالدولہ خورشیدالملک شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء ابوالخیر خاں، دس ہزار منصب دس ہزار سوار، ماہی مراتب، علم، نقارہ پالکی جھالردار، عماری دوہری جھالردار، مورچھل، جواہرات و محلات متفرقہ محاصلی چالیس لاکھ سے سرفراز ہوئے۔

۱۲۱۵ھ میں نواب نظام علی خاں بہادر نے اپنی صاحبزادی بشیرالنسا بیگم صاحبہ کو آپ کے عقد نکاح میں دیکر عزت افزائی کی۔ آپ کو ریاضیات اور فلکیات کا شوق تھا۔ عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی کے بھی ماہر تھے آپ کی تالیفات سے "ستہ شمسیہ" اور "منتخب البصر" وغیرہ مشہور ہیں اول الذکر کتاب ایک فرانسیسی ماہر ریاضیات موسیو کلارک کی تصنیف کا ترجمہ ہے جو ریاضی کی اعلیٰ تصنیف ہے عربی اور فارسی کے علاوہ غیر زبان سے جو پہلا ترجمہ دکن میں ہوا غالباً وہ یہی "ستہ شمسیہ" ہے۔

آپ نے ۱۹ ارشوال ۱۲۷۹ھ کو انتقال کیا اور برہنہ شاہ صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ آپکے پانچ فرزند تھے۔

۱- نواب فخرالدین خاں بہادر جو ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور چودہ سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ میں انتقال کیا۔

۲- نواب رفیع الدین خاں بہادر نامور جنگ عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث امیر کبیر ثانی۔

۳- نواب سلطان الدین خاں بہادر سیف جنگ محتشم الدولہ بشیر الملک ۱۲ ارمضان ۱۲۲۹ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۵ ارذیقعدہ ۱۲۶۱ھ کو انتقال کیا۔ آپ کے دو فرزند وزیرالدین خاں محتشم جنگ (ولادت ۱۲۵۴ھ وفات ۱۲۹۷ھ) اور مظہرالدین خاں بہادر رفعت جنگ بشیرالدولہ آسمان جاہ تھے۔

۴- نواب بدرالدین خاں بہادر، رفعت جنگ معظم الدولہ معظم الملک متخلص بہ تمیز۔

۵- نواب رشیدالدین بہادر اقتدار الملک امیر کبیر ثالث۔ نواب بدرالدین خاں بہادر، فخرالدین خاں امام جنگ امیر کبیر اول کے چوتھے فرزند تھے۔

بدرالدین خاں بہادر ۲۵ صفر ۱۲۲۰ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی قرآن مجید حفظ کیا اور فنون سپہ گری میں خاصی مہارت حاصل کی۔ ۱۲۴۵ھ میں نواب ناصرالدولہ بہادر نے اپنی تخت نشینی کی دوسری سالگرہ کے موقع پر رفعت جنگ معظم الدولہ خطاب مرحمت فرمایا۔ ۱۲۴۹ھ میں ۲۲ ذیحجہ کو حیدالدولہ

علی اللہ خاں بہادر کی صاحبزادی سے شادی ہوئی ۱۶ ذیحجہ سے شادی کی دعوتیں شروع ہوئیں اور ہر طبقہ کے لئے علحدہ علحدہ انتظام کیا گیا۔ ۲۷ ذیحجہ کو مہاراجہ چندو لال بہادر کی دعوت کی گئی، اور رات میں امرائے دربار مدعو کئے گئے۔ ۲۲ ذیحجہ کو جلوہ ہوا اور کئی روز تک جشن رہا۔

۱۲۵۶ھ کو بہ تقریب جشن نوروز معظم الملک خطاب عطا ہوا ۔ ۲۴ رمضان ۱۲۶۱ھ کو بدرالدین خاں حج و زیارت کے لئے روانہ ہوئے اور ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہوکر واپس آئے۔ شمس الامراء بہادر عمدۃ الملک واقتدار الملک وغیرہ نے آصف نگر تک بڑھ کر استقبال کیا اور عماری میں سوار کراکر روپیہ نثار کرتے ہوئے واپس لائے۔

آخر ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو انچاس برس کی عمر میں انتقال کیا اور حیدر آباد میں دفن ہوئے مولف تاریخ رشید الدین خانی نے " حیف معظم الملک " میں تاریخ نکالی ہے۔ ایک خرد سال لڑکی بدرالدین خاں کی یادگار تھی مگر اس نے بھی قبل بلوغ انتقال کیا۔

مولف تاریخ خورشید جاہی لکھتے ہیں کہ " نہایت ذی جرأت، صاحب ہمت، بلند ارادہ حاجی، شاعر خوش فکر خط ظفر خوب لکھتے تھے " مولف تاریخ گلزار آصفیہ نے ان خاص الفاظ سے تعارف کرایا ہے " امیریست عالی ہمت صاحب نفس قدسیہ، حافظ قرآن شریف کلام الٰہی، غریب پرور، ترحم شعار بر حال افتادگان روزگار، غم خوار، قدر دان اہل علم، بہ علوم عقلی و نقلی یکتائے عصر، کشادہ جبیں "۔

مولف تاریخ رشید الدین خانی کا بیان ہے کہ درگاہ اُجالا شاہ صاحب کے میدان میں بدرالدین خاں بہادر حضور پرنور کے ہمراہ تھے اتفاقاً آپ کا ہاتھی بھڑک گیا اور چنگھاڑیں مارتا ہوا خاصہ کی ہتنی کے پاس پہونچ گیا جس پر بندگان عالی تشریف فرما تھے، بدرالدین خاں بہادر ہاتھی پر سے کود پڑے اور تلوار کھینچ کر سونڈ پر دو وار ایسے کئے کہ ہاتھی منھ پھیر کر بھاگا اور آپ گھوڑے پر سوار ہوکر سواری مبارک کے ہمراہ واپس ہوئے ڈیوڑھی پر آئے تو شمس الامراء بہادر نے سینہ سے لگا لیا اور اس جسارت اور بہادری کی تعریف کی۔

جناب عمر یافعی کے پاس ایک قلمی تذکرہ نقش کا ہے جس میں بدرالدین خاں بہادر تمیز تلمیذ فیض لکھا ہے اس کے علاوہ ہمیں کسی اور جگہ آپ کے تلمذ کا حال نظر نہیں آیا فیض سے تلمذ رکھنا قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ حضرت فیض ہمعصر تھے اور شمس الامراء کے دربار سے بھی تعلق رکھتے تھے۔

بیعت کی نسبت کسی نے کچھ نہیں لکھا مگر وہ خود کہتے ہیں ؎

جب سے بدرالدین ہوا بندہ رفیع الدین کا
تب سے اس کے اور ہی رتبہ ہوا آئین کا

مولف گلزار آصفی کا بیان ہے کہ مولانا رفیع الدین قندہار (دکن) کے باشندے تھے نواب سکندر جاہ بہادر کے

زمانہ میں حیدر آباد تشریف لائے اور ہزاروں آدمیوں کو مُرید کیا روزانہ اس قدر ہجوم رہنے لگا کہ آپ کے گھر پر ست آمد و رفت مشکل ہو گئی نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر کو یہ بھیڑ بھاڑ پسند نہ آئی اور انھوں نے حضور میں عرض کیا کہ مولانا کے مُریدوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اگر یہی جوش و خروش رہا تو وہ دن قریب ہیں کہ حضور اور میں بے کار ہو جائیں گے اور مولانا کی حکومت رہے گی ان کا بلدہ میں رہنا قرین مصلحت نہیں۔ اسی معروضہ کی بناء پر مولانا کو وطن واپس جانے کا حکم ملا اور وہ قندھار تشریف لے گئے۔

یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا کے بلدہ سے جاتے ہی نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ کے معروضہ کو ان کی شیعیت اور تعصب پر۔ اعظم الامراء کی موت کے متعلق کہ وہ قضائے الٰہی سے مرے یا مولانا کی بد دعا سے ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے مگر ان کے معروضہ کے متعلق اسقدر ضرور کہیں گے کہ مصلحت وقت یہی تھی اور ایک مدبر دیوان کو یہی کرنا چاہئے تھا جو انھوں نے کیا ورنہ وہ مذہبی لحاظ سے بالکل غیر متعصب تھے۔ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ حضرت مغفرت منزل کے عہد میں شمس الامراء بہادر امیر کبیر اول نے مولانا رفیع الدین کو پھر قندھار سے بلوایا اور جان علی خاں کے مقبرے کے باغ میں ٹھہرایا اسوقت مولانا کے دیدۂ ظاہری بند ہو چکے تھے اور عام لوگوں سے ملتے بھی نہ تھے۔ چند روز ٹھہر کر شمس الامراء بہادر کے تمام خاندان کو مُرید کیا اور پھر قندہار واپس تشریف لے گئے اور وہاں پہونچتے ہی انتقال فرمایا۔

بدر الدین خاں تمیز کا دیوان بڑی تقطیع کے ۱۵۰ صفحات ۱۵ سطری مسطر پر ہے پورے دیوان کے حاشیہ کی لکیر طلائی ہے، سرورق (لوح) مطلا و مذہب ہے اکثر غزلیں بڑی بڑی ہیں دو غزلہ سہ غزلہ اکثر ہیں۔ چار مخمس ہیں، ایک سودا ایک ہمدم ایک جرات ایک آفاق کی غزل پر، ایک قصیدہ بھی ہے اور ایک ترجیع بند جس کے (۱۸) بند ہیں اس کا خط نہایت ہی پاکیزہ اور کاغذ بہت ہی عمدہ ہے یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں آخر آبان ۱۳۲۱ف میں داخل ہوا ہی مشہور اساتذہ کی غزلوں کے جواب میں غزل کہی ہے۔ ہر ایک غزل پر " درجواب فلاں " لکھا ہوا ہے۔

میر کی مشہور غزل پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

گزار جب کہ چمن میں وہ نونہال کیا — خرام ناز سے ہر گل کو پائمال کیا
کبھو نہ ایک بھی اس کے اثر کیا دل پر — اگرچہ ہجر میں نالے ہزار سال کیا

اور ایک میر کی غزل کا جوابی شعر دیکھئے:۔

گزر تیست اس طرح گی بس از مرگ ہر میں — تا سب کہیں یہ روز کوئی نیک مرد تھا

سودا کی ایک غزل پر غزل کہی ہے، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

جب دیا بادہ بصد غصہ دیا ساقی نے — ہاتھ سے اس کے خوشی سے نہ کبھو جام لیا

شاہ نصیر کی دو غزلوں کا جواب لکھا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں :۔

تھے جو منعم انکے ہے بس ماند گوں کا یہ معاش — کھودنا اور گھر کی اپنے خاک پتھر بیچنا
دیکھ کر جلوہ مرے رشکِ مہ پر نور کا — بھول جاویں حضرتِ موسیٰ جھگڑا طور کا

ذوق پر زیادہ مہربانی تھی ان کی اکثر غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

شور سُن وہ اور بھی برہم ہوا نازک مزاج — نالۂ دل کا مرے اس کو اثر اچھا ہوا
وہ ہے مشکل کشا، ہے شرم میری اے تمیز اسکو — میں اپنی مشکلیں سب حیدر کرار کو سونپا

ظفر کی غزل پر بھی غزل کہی ہے اس پر لکھا ہے "در جواب مرزا ابوظفر ولیعہد فرزند کلاں اکبر شاہ از دہلی آمدہ"

اس کے ہنسنے سے مرا غنچۂ دل تنگ کھلا — باغ میں کوئی بھی بلبل نہ گل اس رنگ کھلا

سلیمان شکوہ کی غزل کا جواب بھی دیا ہے :۔

بیتاب دل ہمارا شب یار بن تمیز آہ — سو بار گھر میں آیا سو بار گھر سے نکلا

سراج کی غزل کے جواب میں ایک شعر ملاحظہ ہو :۔

صبر و شکیب تاب و تواں کے اُڑے حواس — اس کے جو تیر ناز نے دل میں اثر کیا

آفاق کی غزلوں کا جواب بھی ہے۔

یہ بادِ صبا تو نے کیا شغل کیا پیدا — شبنم کو رلا دینا اور گل کو ہنسا دینا
سادہ رو کے رخ پہ شاید خط نمودار اب ہوا — خط جو اس کے پاس سے لے نامہ بر آنے لگا

مہاراجہ چندو لال بہادر شاداں کی غزل کے جواب میں بھی غزل موجود ہے۔

دل میرا تجھ سے بہت صاف تھا اب تک کہ اب — جانبِ غیر کیا تو جو اشارا، چمکا

ہمدم کی غزل کا جواب بھی ہے :

کسو کا یاد آتا ہے وہ عالم نوجوانی کا — ادا کا، آن کا، انداز کا، نازک میانی کا
ملائیں صورتیں ماٹی میں کیا کیا خوبرویوں کی — کہوں شکوہ کہاں تک آسماں کی ظلم رانی کا
تمیز اس بات کی کیجو بقول مصرعۂ ہمدم — نمودِ آدم کی ہے ہو بلبلہ جس رنگ پانی کا

تمیز نے مشاعرہ میں بھی طرحی غزلیں کہی ہیں بعض غزلوں پر مشاعروں کے نام ہیں۔

شگفتہ ہیں گل آب جو میں رواں ہیں — عجب موسمِ خوش یہ برسات لایا

اس غزل پر "بہ غزل طرحی شمس الامرار بہادر" لکھا ہوا ہے ایسی ہی اور غزلیں بھی ہیں۔
مطلع عموماً اچھے کہے ہیں :۔

صنم، صبح، شکر خدا آن نکلا
جو کچھ اپنے جی میں تھا ارمان نکلا

کل میں جوں آئینہ اسکا منھ جو تک کر رہ گیا
اس کا بھی غصہ سے کچھ نتھنا پھڑک کر رہ گیا

ایسی کیا تقصیر کی ہے میں نے اے دلبر بھلا
کر رہا جور و ستم ہے اتنا کیوں مجھ پر بھلا

کیوں نگر پھینکتے ہو دزدیدہ
اس قدر کیوں ہو مجھ سے رنجیدہ

نہ اُٹھے پھر جو وہ شب سوئے پہر کے بجتے
چونک اُٹھے صبحدم اک بار گجر کے بجتے

کس طرح دل سے رہِ کوچہ جاناں چھوٹے
کیونکہ بلبل سے بہاراں میں گلستاں چھوٹے

امید ان سے رکھوں کیا میں آشنائی کی
بتوں کے کوچہ سے آتی ہے بو خدائی کی

لطف زبان ملاحظہ ہو:-

بحر غم میں ڈبو دیا دل نے
نہ کیا وار ہی نہ پار کیا

نہ آہوں کا اثر اس کو نہ کچھ تاثیر نالوں کی
نظر آیا بتِ کافر کا دل کچھ سنگ خارا سا

کیا نصیبوں کا لکھا تجھ سے کہوں آہ تمیز
لیکے قاصد سے وہ مکتوب مرا چاک کیا

میں دیکھ کر انھیں جو ہوا غش تو وہ کہے
تم تو ابھی کھڑے بھلے چنگے تھے کیا ہوا؟

وائے قسمت طلب بادہ پہ شب ساقی نے
شیشہ کو چور کیا غصہ سے ساغر پھینکا

بعض بہاریہ شعر اچھے کہے ہیں:-

یہ برق چمکتی نہیں رقاص پری ہے
یہ رعد نہیں، بجتی ہے مردنگ ہوا پر

آمد ہوئی اے بلبل پھر فصل بہاراں کی
رہتا ہے گلستاں میں صیاد خدا حافظ

رات دن اپنا گزرے ہے یوں بکوئے گلرخاں
عندلیباں موسم گل میں پھریں جوں باغ باغ

امڈی ہوئی گھٹائیں بجلی چمک رہی ہے
گلشن میں بادہ پیویں لے بادہ خوار ہم تم

کرتے ہیں میکشی مست اب زیر تاک بیٹھے
بدلی سے مت دکھا منھ لے آفتاب اس وقت

بحر طویل میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں اچھی کہی ہیں۔

گیا باغ میں صبح جیوں غیرت گل تو دیکھ اس کا رخ اور قامت قیامت
حواس اُڑ گئے بلبل و قمریوں کے گل و سرو کا دل خیاباں سے کھنچا
تمیز اس کو شرم اور مجھے اضطرابی کشاکش ہی میں وصل کی رات گزری
گھڑی رات باقی رہی ہووے گی تب بزور اس کو حجرے میں دالاں سے کھینچا

امیر ابن امیر تھے مطلوب کی گالی کا بھی اثر بُرا لیتے تھے۔

مجھ کو سر مجلس نہیں دشنام گوارا | کہنا ہو جو تم کو سو کہو کان میں صاحب

کبھی یاران گزشتہ پر بھی آنسو بہاتے ہیں۔

فرہاد و قیس و وامق و مہیار اور نل | ہیہات اُٹھ گئے ہیں یہ کیا یار چار پانچ

فرہاد، قیس، وامق، نل تو مشہور ہیں۔ مہیار بھی ایک ایسا ہی منچلا تھا جس کا "عشاقِ دکن" میں وہی مرتبہ ہے جو مجنوں کا عرب میں فرہاد کا عجم میں۔ بعض شعر نہایت ہی بے ساختہ کہے ہیں۔

آہوں کی مرے دیکھتے ہی شعلہ فروزی | شب کرمکِ شب تاب ہوئی ونگ ہوا پر

اس شب تو ساقیا مہ و انجم کا ہے سماں | بیٹھے جو تیرے گرد ہیں میخوار سو بچاس

آگے مہیار کا ذکر ہو چکا ہے اب اس کی محبوبہ چندر بدن کو مخاطب کرتے ہیں:۔

سُن اے چندر بدن اب اور تو کیا چاہے ہی | دیا مہیار نے جی تیرے اک ارشاد کے ساتھ

ایک غزل میں سراپا بیان کیا ہے:۔

ٹک چشم تصور سے دیکھو تو سراپا کو | اعضائے بدن اس کے سانچے کسی ڈھالے ہیں

مژگاں وہ نکیلے ہیں یا تیر ہیں یا نشتر | یا سیل ہیں یا بلّم برچھی ہیں کہ بھالے ہیں

توصیف میں اس رخ کی انشائے ظہوری ہے | وصف خطِ نو خط میں طغریٰ کے رسالے ہیں

کیونکر کہوں زلفوں کو کالوں سے ہی ہم شیری | خونِ دلِ عاشق سے دو ناگ وہ پالے ہیں

معنوی کیفیت کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

قدم رکھے ہیں زمین پر کب اہل کیفیت | کہ ہاتھوں ہاتھ چلے ہے ایاغ مجلس میں

میر سوز نے ایک معرکۃ الآرا غزل کہی ہے:۔

مری جان جاتی ہے یارو سنبھالو | کلیجہ میں کانٹا چبھا ہے نکالو

اسی زمین میں تمیز نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

نہ لچکے کمر دل دھڑکتا ہے میرا | یہ نازک ہے پہونچا نہ گیندیں اُچھالو

چلا روٹھ کر یار میری طرف سے | کوئی پاؤں پڑ کر ذرا تو منالو

اگر یار غصہ ہوا تو تمیز اب | رہو دم بخود کچھ نہ بولو نہ چالو

کچھ متفرق شعر بلا انتخاب نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہائے بخت خفتہ کیوں شب آنکھ میری لگ گئی | پھر گیا دروازہ پر سے یار گھبرایا ہوا

نہ رکھیں عالم مستی میں مطلق کچھ خبر اپنی | خدا کے واسطے مستوں کو اے ساقی جھکا اتنا

چشمِ تر میں ہے تصور تری زلف و رُخ کا　　ابرِ مژگاں سے مرے برسے ہے باراں شب و روز

گردشِ افلاک سے کیا کیا صفیں برہم ہوئیں　　ہے کہاں بزمِ فریدوں جشن کیکاؤس حیف

ہزاروں ڈھب سے ہم کہتے ہیں انسے حالِ دل لیکن　　وہاں کچھ پیش جاتی ہی نہیں ہیں اپنی تقریریں

گھر اسکے شب جا کے حالِ دل میں کہا تو لوگوں سے اپنے ڈر کر　　کہا کہ ٹک تو ل تو ٹے بولے نہ اسقدر کر پکار باتیں

ہے شاعروں میں ہمدم و آفاق و شہرت اب　　خوش فکر ہیں یہ بندۂ سرکار اک دو تین

بے حیا غیر، کہائے گا دشنام　　تم بھلا اب سے مرا نام تو لو

خبردار اے دلِ غافل کر دم کا　　گیا کچھ قافلہ کچھ چل رہا ہے

ایک قصیدہ بھی کہا ہے جس کی تمہید نہایت ہی اچھی ہے (۵۴) شعر صرف تمہید کے بعد سراپا کے ہیں کل قصیدہ ایک سو شعر کا ہے:۔

چلی صبح ہوتے جو بادِ بہار　　تو کچھ نیند سی آگئی ایک بار

نظر آئی اک مہ جبیں خواب میں　　کہ خورشید ہو جس کے رُخ پر نثار

کروں حُسن کا اس کے کیا میں بیاں　　اسے دیکھ کر دل ہوا بے قرار

مصفیٰ تھے رخسار آئینہ سال　　جبیں اس کی تابندہ تھی ماہ وار

مہ نو کی تفسیر تھیں ابروئیں　　کہے تو وہ تھی تیز دم ذوالفقار

وہ دو چشمِ میگوں تھے دو جام و مل　　وہ دو ترک، مردم تھے دو بادہ خوار

جب اس طرح وہ مجھ کو آئی نظر　　میں پوچھا تو کون ہے اے نگار

کہا مجھ سے واقف نہیں ہے تو کیا　　مرا نام ہے خرمی و دیار

میں آئی ہوں تجھ کو یہ دینے نوید　　ذرا خوابِ غفلت سے ہو ہوشیار

میں اس کی گرہ سال کی رکھ خبر　　جو نواب ہے آج با اقتدار

کہیں ہیں اسے شمس الامرا، تمام　　ہے مانندِ شمس اس کا نام آشکار

باپ کی مدح میں بیٹے کا قصیدہ ایک انوکھی چیز ہے مگر قدما میں یہ طریقہ معیوب نہ تھا ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں

شکر گنج کے خاندان میں ہے تو　　نہیں تجھ سا پھر کوئی عالی تبار

آخری دعائیہ شعر یہ ہیں:۔

دعا پر بس اب ختم کر لے تمیز　　وہ زندہ رہے تا بہ روزِ شمار

ہے ذاتِ مقدس و یکتائے عصر　　کوئی اس کا ثانی نہیں زینہار

سدا خوش رہے آل و اولاد سے ۔۔۔ سلامت رکھے اس کو پروردگار
ہوا خواہ اسکے جو ہوں خوش رہیں ۔۔۔ عدو اس کے ہوویں ذلیل اور خوار

دیوان میں ایک ترجیع بند بھی ہے جس کے (۱۸) بند ہیں:۔

کس خود نما سے آئینہ ساں ہو گیا دوچار ۔۔۔ کوئی تو آنکھ میں ہے چڑھی شوخ طرحدار
نرگس سا رنگ زرد ہے تن ہے نحیف و زار ۔۔۔ تاب و تواں کنارہ کشی پر ہیں ایک بار
دل کس کی چشم مست کا سرشار ہو گیا
کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

گلخن نمط ہے گرم مرا سینہ ہمنشیں ۔۔۔ اخگر کی طرح گرنے لگے اشک آتشیں
ہر دم شرار ریز ہوا نالۂ حزیں ۔۔۔ جل گئی متاعِ صبر و تواں کچھ رہا نہیں
"شعلے بھبو کے اٹھنے لگے دل کے داغ سے"
"آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

ہر شئے میں ہر جگہ میں تو ہے یار جلوہ گر ۔۔۔ رکھتا تمیز تیری تجلّی پہ ہے نظر
سنتا ہے رات دن تری آواز کان دھر ۔۔۔ ہر دم ہر آن لو میں تری ہے یقین کر
کیا فرق داغ گل میں اگر گل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

موجودہ نواب لطف الدولہ بہادر صدر المہام سرکار عالی و والی پائیگاہ خورشید جاہی نواب تمیز کے بھائی کے پوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ نواب تمیز کے دیوان کے طبع کا انتظام فرما کر خانوادۂ خورشید جاہی کے ایک ادبی کارنامے کو محفوظ فرما دیں گے۔

سید تمکین کاظمی

(نگار) نواب تمیز کا مجموعۂ کلام میں خود کتب خانۂ آصفیہ میں دیکھ چکا ہوں، لیکن اس ارادت و عقیدت کے ساتھ میں نے کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا جس سے جناب تمکین کاظمی نے کام لیا ہے۔ چونکہ یہ مجموعہ وہاں کے ایک امیر سے منسوب ہے اور اب سے تقریباً سوا سو سال کی دکنی شاعری و دکنی زبان کی یادگار ہے، اس لئے اس کی اشاعت مناسب یا ضروری جو کچھ قرار دیجائے ٹھیک ہے، ورنہ یوں تغزل و شاعری کے لحاظ سے اس میں کوئی بات نہیں پائی جاتی — نواب تمیز کے

اکثر اشعار وہی ہیں جو بہ تبدیل الفاظ دوسرے ہمعصر یا متقدم اساتذہ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں اور اُن سے ہٹ کر جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو نثر تو اس لئے نہیں ہے کہ کلام موزوں ہے اور شعر اس لئے نہیں کہ محاسن شعر و تغزل میں سے کوئی بات اس میں نہیں پائی جاتی۔

جناب تمکین نے اس مضمون میں نواب تمیز کے اشعار بکثرت نقل کئے تھے اور ان کی کافی داد بھی دی تھی، لیکن میں نے اس "حسن ظن" کے اکثر حصہ کو نکالدیا۔ رہگیا اس مقالہ کا شائع کرنا سو، وہ اس لئے ضروری سمجھا گیا، کہ دکنی شاعری یا دکنی زبان کی تاریخ سے بہر نوع اس کا تعلق ظاہر ہے اور اس بنا پر اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

"نگار" جنوری ۱۹۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:-

ہندی شاعری کا پہلا دور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت - چندر بردائی - اور اسکے ہمعصر شعراء - جگ نائک - سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری - گورو گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونہ کلام - اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام - رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ - جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دور:- (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور ان کے پہلے کے بھگت شعرا - مقلدین رامانند - بھاؤنند رے داس بھگت - کبیر - گورو نانک دیو - میراں بائی - ملک محمد جائسی - تلسی داس - سور داس - عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ۔

ہندی شاعری کا تیسرا دور:- (بزمیہ شاعری کا آغاز) کیسو داس اور ہندی شاعری کا عروج - کیسو داس کے ہمعصر سندر داس سیناپت یا بادین - دیال گر - بھوشن - متی رام - چنتامنی - شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ - گردھر کوی رائے اور ان کی کنڈلیاں - اس عہد کے بعض سنت شعراء اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء - ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم:- (سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد) للو لال - سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری - موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار - بھارتند و بابو ہرشچندر - پدماکر - بینی پردین - سری دھر پہاٹک کی شاعری شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ ہندی شاعری پر اُردو کا اثر - ہندی کا اثر - ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے اور اُردو رسم الخط میں بھی - ضخامت کا اندازہ ۳۰۰ صفحات کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت عہ/ ہوگی - لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائے گی۔

منیجر نگار

انقلاب کا اثر روسی زبان پر

دنیا اس وقت جس دور ترقی سے گزر رہی ہے اس میں روس ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے سنہ ۱۷ء کا انقلاب روس کے غربا کے لئے ایک ابر رحمت تھا۔ صدیوں سے روسیوں کا وہ "ذلیل" طبقہ جو تمام دن محنت کرنے کے بعد بھی شام کو پیٹ بھر کر کھانا نہ کھا سکتا تھا اس کو انقلاب نے روٹی دلوائی، رہنے کو پست جھونپڑے کے عوض پختہ اور عالیشان مکان دیا اور ہفتہ میں ایک بار اس کی بیوی اور بچوں کی ہوا خوری کے لئے موٹر گاڑی کا سامان کر دیا۔ انقلاب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ بذات خود اتنا دلچسپ واقعہ ہے جیسے الف لیلیٰ کی کوئی کہانی چونکہ موجودہ بحث نفس انقلاب سے نہیں بلکہ انقلاب زبان سے ہے اس لئے اس حکایت لطیف کو کسی دوسری صحبت کے لئے چھوڑتا ہوں۔

روسی ادب، روسی تہذیب کی طرح پرانا نہیں بلکہ سترھویں صدی کی پیداوار ہے جب پیٹر اعظم روسیوں کو پکڑ پکڑ کر ان کی داڑھیاں منڈوا رہا تھا اور ان کو فرانسیسی ناچ کی تعلیم دلوا رہا تھا۔ ان کے نیم مشرقی اور نیم مغربی لمبے کوٹوں کو زبردستی ترشوا کر جاکٹ بنوا رہا تھا اس سے پہلے روسی زبان اپنے اہل زبان کی طرح کوئی خاص وضع قطع نہ رکھتی تھی۔ شمال و مغرب، مشرق و جنوب کے رہنے والے دونوں دو قسم کی زبان بولتے تھے جنکو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاتاریوں کی زبان علیحدہ تھی اور کاسکس (Cossacks) بھی اپنی بھاشا الگ بولتے تھے۔ ایسے غیر طبعی ماحول میں نہ تو قومیت پل سکتی ہے اور نہ کوئی قومی زبان پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے قبل مملکتِ روس میں کوئی ایسی ہستی پیدا نہ ہوئی جس پر ہماری نظر پڑے اور جس کو ہم روس کا شاعر یا مصنف کہہ سکیں۔ پشکن (Phushkin) (۱۷۹۹ء — ۱۸۳۷ء) روسی علم ادب کا پیٹر اعظم تھا۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس کو ہم روس کا مصنف، شاعر، قصہ گو الغرض جو چاہیں کہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسکی ...... شاعری اور نثر نگاری روسی علم و ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے مختصر افسانے روسی تہذیب و تمدن، روسی جذبات و خیالات کے بہترین آئینے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ پشکن پر مغربی ادیبوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے خصوصاً شکسپیر اور بائرن کا۔ اس کے خیالات اکثر جگہ ان شعرا کے کلام

سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، مگر چونکہ اس کی تمام باتیں خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں، اس قدر روسی ماحول سے مملو ہیں کہ بالکل اچھوتی معلوم ہوتی ہیں۔ پشکن کا دماغ ایک عالمگیر جذبات کا مخزن تھا۔ اس کے کلام میں قومیت، درد اور حقیقت نگاری کے عناصر خاص طور پر غالب ہیں۔ کبھی کبھی وہ والٹیئر (Voltaire) کی طرح مذہب کے نقاب کو اپنے طعنوں سے چاک چاک کر دیتا ہے اور کبھی ایک روسی دہقان کی طرح صلیب کے آگے دو زانو ہو کر "میڈونا" جیسی نظم کہتا ہے۔ پشکن کی بعض نظموں میں قومیت کی لہر دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا دل مفلس اور بھوکے مزدور کو دیکھ کر دکھ اٹھاتا ہے جو جاڑے کی رات میں صرف آگ تاپ کر صبح کر دیتے ہیں اور تمام دن نشتر چبھونے والی سرد ہوا میں برف پر کام کرتے ہیں۔ وہ آرام طلب امیروں کو دیکھ کر کڑھتا ہے جو غریبوں کا خون چوس کر خود لطیف غذائیں کھاتے ہیں اور رنگین شرابیں پیتے ہیں۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں کسانوں کی "بغاوت" پر پشکن کی نظمیں اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ انیسویں صدی میں رہتا تھا مگر اس کی آنکھیں اسی وقت سے انقلاب کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ الغرض سکندر اول کے دور حکومت میں اگر روسیوں کی کوئی بولتی ہوئی تصویر ہو سکتی ہے تو وہ پشکن کی تصنیفات ہیں۔ پشکن کے بعد نکولس گوگل (Nicholas Gogol 1852-59) روسیوں کا دوسرا مصنف ہے جس کا کلام روسیوں کے اس درد و غم کا سرمایہ ہے جو اندر رہی اندر ان کی سوسائٹی کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ گوگل کے افسانے اس بوجھ کی میزان ہیں جو "اعلیٰ" "ادنیٰ" پر ڈال رہا تھا۔ اس کے افسانے واقعات کے اظہار ہیں۔ ان کو پڑھ کر دل بیٹھ جاتا ہے اور طبیعت اُداس ہو جاتی ہے۔

"لبادہ"، "انسپکٹر جنرل" "مردہ ارواح" ایسے افسانے ہیں جن کا جواب دوسری زبانوں میں مشکل سے ملتا ہے۔ ان افسانوں میں ظلم و تشدد کا نقشہ کھینچ دیا ہے اور یہ نقشہ ہم ہندوستانیوں کے لئے بہت مانوس چیز ہے۔ ان افسانوں کا ہر شخص ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہمارا ملاقاتی ہے یا ہم اکثر اس کو دیکھتے ہیں، اور اس کا ذکر سنتے ہیں۔ گوگل کی پھبتیاں جو وہ روس کے تشدد پسند حکام پر کستا ہے روسی زبان کے بہترین شاہکار ہیں۔ ٹالسٹائی (Tolstoi) ہمارے مصنفوں کی فہرست میں تیسرے درجہ پر آتا ہے اگرچہ اس کی عالمگیر شہرت اس کو روسی مصنفوں میں پہلی جگہ دلواتی ہے۔ اس کے ناول اور دیگر تصنیفات دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ "انا کرینیا" "اصلاح" "کاسک" "جنگ و صلح" اس کی غیر فانی کتابیں ہیں جو اس کو ڈوما، روسو، گیٹے، وکٹر ہیوگو وغیرہ نے مثل مصنفوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ ٹالسٹائی میں گوگل کے خلاف صبر و تحمل کا مادہ زیادہ ہے۔ جہاں گوگل طعنہ زنی کرتا ہے وہاں ٹالسٹائی صبر و استقلال سے کام لیتا ہے۔ اور انسانی کمزوریوں پر ایک خدا ترس انسان کی طرح پردہ ڈال دیتا ہے۔ ٹالسٹائی کے بعد روسیوں میں اس پایہ کا مضمون نگار کوئی نہیں رہا گرچہ اس کے بعد اور انقلاب ۱۹۱۷ء کے قبل تک چیخو (Chehov) انڈریو (Andreyew) کورولنکو (Korolenko) کپرن (Kuprin) وغیرہ کے نام آتے ہیں ان میں شاید سب سے

زیادہ نازک مزاج اور رحم دل کورو تنکو ہے۔ اس کی ہر تصنیف میں زندگی اور آلام زندگی کا رونا ہے۔ آسمان اور زمین کا تعلق ایک دوسرے سے امن پسند اور ہموار ہے مگر اندھے انسان نے آکر ان کی ہمواریوں کو مٹا دیا ہے۔ اسکے افسانے تمامتر پکار رہیں مدد کے لئے کہ کوئی آئے اور اس اُلجھے ہوئے انسان کو آزادی اور امن کا راستہ دکھائے۔

متذکرہ بالا مصنفوں کے دور میں روسی زبان نے ایک خاص خصوصیت حاصل کرلی۔ حقیقت نگاری روسی مصنفوں کا تمغۂ امتیاز ہو گیا۔ روسیوں کو اشیا سے چونکہ بہت زیادہ تعلق تھا اور ہے اس لئے روسی تہذیب میں اشیائی باتوں کا بھی دخل ہو گیا مثلاً روسی، انقلاب سے پہلے، خدا کا قایل اور مذہب کا فریفتہ تھا۔ روسی مصنفوں کا بھی یہی حال ہے کہ خدا اور خدا ترسی کی باتیں ان کے ہر ورق میں سنائی دیتی ہیں۔ ٹالسٹائی کو اگر صرف اس کی تصنیفوں سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ کوئی بہت بڑا ریش دراز برزگ والا تقدس مآب پاپائے اعظم ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے وعظ و تلقین کا نعرہ لگا رہا ہے۔ اس کی زبان سے محبت و رحم کا دریا اُبل کر تمام دنیا کو سیراب کرنا چاہتا ہے۔ کتاب ختم کرنے کے بعد اس کا پڑھنے والا کچھ دیر کے لئے معصوم صفت ضرور ہو جائے گا۔ روسی کتابیں پڑھنے کے بعد معاً یہ خیال آتا ہے کہ اسکے پڑوس کے رہنے والے جرمن اور فرانسیسی بھی اس زمانہ میں سوچتے اور لکھتے تھے مگر ان کے خیالات اسقدر خدا اور مذہب سے کیوں دور ہیں؟ یہاں پر کچھ دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کرکے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ روس میں اسوقت ہزار میں دس آدمی پیٹ بھر کر کھاتے تھے وہاں بھوک اور مانگ کی ایک لہر دوڑ رہی تھی جو دل کے دھڑکن کو آہستہ کر دیتی تھی اور دماغ کو مفلوج۔ ایسی حالت میں جبکہ مفلسی منہ تاک رہی ہو اور معدہ کھانا مانگتا ہو سوائے خدا اور مذہب کے کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ جب امیروں کے دروازے غریبوں پر بند ہو جاتے ہیں تو غریب اپنی تنگ کوٹھری میں جاکر تاریکی میں اپنے دل کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور خدا کو بلاتا ہے۔ اس کے آگے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، پیغمبروں کی دہائی دیتا ہے پھر ولیوں کی، آخر میں ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ اسوقت روسی زبان کے جاننے اور لکھنے والے بھوکے تھے اور ننگے۔ ان کا دکھ معدودے چند کے آرام کا سبب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیف کے ہر ورق میں ناکام غصہ، بھوک اور پیاس، خدا اور فریاد ہے اور آخر میں سُرخ آنکھوں کی غضبناکیاں اور دانت پیسنے کی آواز ان کے قلم کی نکلی ہوئی باتیں ایسی دھمکیاں ہیں جن کو پڑھ کر جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوتی ہے۔

پھر ۱۹۱۷ء کا انقلاب آیا۔ غریبوں نے لاٹھیاں اُٹھائیں، کمر کس کر باندھا اور اپنے کاندھے سے بادشاہ اور بادشاہ کے بوجھ کو اُتار کر پھینکدیا جو صدیوں سے ان کی ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑے ڈالتی تھی اسکے بعد طوائف الملوکی اور غارتگری کا زمانہ آیا۔ روس کی سرزمین پر انسان کے بدلے بھیڑیئے پھیل گئے جو ایک دوسرے کو چیرنے لگے صدیوں کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ شہر اور دیہات میں جمی ہوئی برف سُرخ ہو گئی ۔ انسان کا خون بھی

بہ کر جم گیا۔

ایسے مار کٹائی کے دن اور خوف و ہراس کی راتوں میں پرانے لٹریچر کے پرخچے اُڑ گئے۔ پشکن اور ٹالسٹائی کا رنگ ان کے ساتھ چلا گیا۔ روسی ادب نے خداترسی اور پارسائی کے لبادہ کو اُتار کر رکھ دیا۔ اب دل کھول کر باتیں ہونے لگیں وہ اگلی سی چھپی اور دبی ہوئی اشارہ کنایہ کی باتوں کی ضرورت نہیں رہی۔ انسان آدمی کی طرح رہنے لگا۔ غلامی اور بیکاری افسانہائے ماضی ہو گئیں۔ خوشی اور فارغ البالی کا دور آیا۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ روسی لٹریچر کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ لینن، ٹراٹسکی، گارکی، سولوگب وغیرہ کی تصنیفوں کو دیکھئے تو عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ ان کی ہر بات صاف، مختصر اور نہایت آزاد ہے۔ میرے خیال میں ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی قوم نے اتنی آزادی سے قلم نہیں اُٹھایا ہوگا۔ ان کے خیالات اتنے بے باک اور نڈر ہو گئے ہیں کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ وہی قوم جو صرف اٹھارہ سال قبل صدیوں پرانی رسموں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی یک بیک اسقدر آزاد کیونکر ہو گئی؟ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ صدیوں سے نہایت آزاد ماحول میں پرورش پارہے تھے۔ ان کی بات بات پر عقل سلیم کی دلیلیں، جگہ جگہ پر صاف اور لطیف استعارے، قدم قدم پر ہنسی کی ہلکی سی لہر، خیالات میں اتنی آزادی کہ، مذہب بوڑھی عورتوں کی مہمل بکواس، خدا بائبل کا دقیانوسی خدا اور یسوع انسان کا بیٹا ہو کر رہ گیا ہے۔ طرز گفتگو میں اتنی قوت اور دلائل اتنے عام فہم اور حقیقت پر مبنی کہ سوائے ماننے کے اور کچھ بن نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ روسی زبان جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اگر یہ حالت زیادہ نہیں صرف بیس سال تک اور قائم رہ گئی تو انسان کو اپنے دماغ میں نئی چیز اور نئے خیال کو سمجھنے کے لئے ایک اور خانہ کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ ڈانٹے (Dante) کا دوزخ اور اعراف قرون وسطیٰ کے یوروپین اقوام کے لئے جیسے بالکل بعید از وہم و قیاس بات تھی اسی طرح روسی علم ادب ہماری اولاد کے لئے ایک نئی شاہراہ عقل و دلیل کے لئے کھول دے گا جس کی زمین بھی نئی ہوگی اور آسمان بھی نیا۔

ڈاکٹر محمد نصیر الدین

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

کی

طباعت شروع ہو گئی ہے

منیجر نگار

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

انطانی اور کاہنۂ مصر

روم کی ہزیمت خوردہ فوجیں ساحلِ فنیقیا تک واپس آگئی ہیں اور بحر ابیض کے سفید ریتیلے ساحل پر خیمہ ڈالے پڑی ہوئی ہیں۔ اہلِ لشکر اپنی گزشتہ شکست و ناکامی کی وجہ سے ملول ہیں اور مستقبل کے متعلق فکرمند۔

ان کا سردار انطانی، لشکر کے ہنگامہ اور سپاہ کے شور و غوغا سے گھبرا کر، اپنے رفیق ہتیو مصری کے ساتھ قریب کی اس پہاڑی کی طرف جا رہا ہے، جس کی بلندی اس سے قبل خدا جانے کتنی شکست خوردہ فوجوں اور کتنے فاتح لشکروں کو اپنے دامن سے گزرتی ہوئی دیکھ چکی ہے۔ اس پہاڑی کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف وہ دریا جو آج دریائے کلب کے نام سے مشہور ہے لیکن اُسوقت اُس کو دلیقوس کہتے تھے۔

اب سے چند ماہ قبل انطانی اپنی فوجوں کو لیکر اسی پہاڑی کے نیچے سے گزرا تھا تاکہ وسط ایشیا پر حملہ کر کے وہاں کے ممالک کو اپنا اور اپنی حلیف کلیوپٹرا ملکۂ مصر کا مطیع بنائے، لیکن آرمینیا، فارس اور مابین النہرین نے ایسی بامردی سے مقابلہ کیا کہ انطانی شکست کھا کر پھر بحر ابیض تک واپس آگیا اور یہاں مصری فوجوں کی کمک کا انتظار کرنے لگا۔ انطانی کی ہزیمت و ناکامی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ اس مہم پر روانہ ہوا تو پچاس ہزار سے زیادہ سپاہ اس کے ساتھ تھی اور جب واپس آیا تو صرف دس ہزار رہ گئی تھی اور اب بھوک پیاس کی حالت میں بحر ابیض کے ساحل پر پڑی کراہ رہی تھی۔۔

انطانی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا اور جب تھک جاتا تو کسی چٹان پر بیٹھ جاتا اور دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی کو رکھ کر دور سمندر کی طرف دیکھنے لگتا کہ شاید افق بعید پر مصری جہازوں کے بادبان نظر آجائیں۔۔۔ کبھی اس کی نگاہیں دھوکا بھی دیجاتیں اور جن چیزوں کو وہ بادبان سمجھتا وہ صرف سمندر کی چڑیوں کا جھنڈ ثابت ہوتیں۔

انطانی اسی فکر و تردد کے عالم میں ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک کوے کی آواز سے چونک پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے رفیق کو ڈھونڈا جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، لیکن وہ اسوقت وہ چند قدم دور آگے کھڑا ہوا تھا اور سامنے

کی ایک چٹان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

انطانی اٹھا اور اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور وہ بھی ان نقوش کو غور سے دیکھنے لگا جو چٹان پر نظر آتے تھے۔

یہاں اس وادی میں، اس دریا کے کنارے، اس وسیع و بسیط سمندر کے سامنے اور انھیں مہیب چٹانوں کے پاس سے خدا جانے کتنے لشکر انطانی سے پہلے گزر چکے تھے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنے فاتحانہ انداز سے سربلند گزرے اور کتنے شکست خوردہ و سرنگوں ۔۔ وہ بڑے بڑے زلزلہ افگن سردار، وہ بڑے بڑے جسم پر رعشہ طاری کر دینے والے سپہ سالار۔ جنھوں نے ساری دنیا میں اپنی جرأت و بہادری کا سکہ قائم کر رکھا تھا، آج ابدیت کے بحر ذخار میں ڈوب کر فنا ہو چکے ہیں، اور اُن کی نشانیوں میں سے اب سوائے برباد شدہ زمینوں، تباہ و ویران بستیوں، اور سنسان خرابوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ان چٹانوں پر انھیں فاتحین عالم کے نام منقوش تھے اور جس چٹان کے پاس انطانی اور اس کا رفیق کھڑا ہوا تھا اس پر ریمسیس ثانی فرعون مصر کا نام کندہ تھا۔ انطانی نے اپنا سر اظہار احترام میں جھکایا اور بولا کہ "کسے خبر ہے کہ مری یادگار ان چٹانوں پر کیا ہوگی ایک فاتح سپہ سالار کی سی یا ہزیمت خوردہ نکبت زدہ انسان کی سی"۔

وہ یہ کہتا ہوا دوسری چٹان کی طرف بڑھا اور پھر تیسری چٹان کی جانب اس پر سلما نصر اور سنجاریب (شاہان اشوریا) کے نام منقوش تھے، جو سات صدی پیشتر ادھر سے گزرے تھے۔ ان کا نام دیکھ کر انطانی ماضی کی تاریخ میں غرق ہو گیا اور اسی کے ساتھ خود اپنی زندگی کے تمام ایام ایک ایک کر کے اُسے یاد آنے لگے ۔۔ سب سے پہلا وہ دن جب مصر کی نوجوان ساحر ملکہ (کلیوپیٹرا) سے اس کی نگاہیں دوچار ہوئی تھیں۔ پھر وہ دن جب محبت کا اولین شعلہ اس کے سینہ میں بھڑکا، اس کے بعد وہ دن جب اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیکر کلیوپیٹرا کا طوق غلامی اپنی گردن میں ڈالا۔ پھر وہ دن جب اس نے اسکندریہ میں کلیوپیٹرا کے ملکۂ مصر و قبرص اور فرمانروائے افریقہ و سوریا ہونے کا اعلان کیا اور سب سے آخر میں وہ دن جب سلطنت روما نے اس کو ملت فروش اور غدار وطن قرار دیکر اسکے استیصال کا فیصلہ کیا۔ وہ انھیں خیالات میں محو تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ اس نے گردن اُٹھا کر دیکھا کہ ایک بڑھیا عورت لکڑی کے سہارے سے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف چڑھتی آرہی ہے۔ جب وہ انطانی کے قریب پہونچی تو ٹھہر گئی اور تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد دفعتہً ایک قہقہہ لگایا اور بولی:۔

"اے انطانی، تو اس ویران و وحشتناک مقام پر کیوں آیا ہے، کیا روما کو تباہ کرنے اور شرق و غرب میں جنگ کی تباہیاں پھیلانے کے بعد یہاں اس لئے آیا ہے کہ سانپوں کو ان کی بانبیوں سے نکال کر پریشان کرے، گدھوں کے گھونسلوں میں آگ لگا کر انھیں آشیاں برباد کرے، بھیڑیوں اور لومڑیوں کے بھٹ کھود کر ان کو آزار پہونچائے، کیا دنیا میں اب کوئی انسان تیرے ظلم کا نشانہ بننے کے لئے باقی نہیں رہا۔"

انطاکی حیران تھا کہ یہ کون عورت ہے جو اس طرح بیباکانہ گفتگو کر رہی ہے اس نے اپنے رفیق کی طرف مخاطب ہو کر کہا:-

"اے ہیتیو، یہ بڑھیا کون ہے۔ کیا تم پہچانتے ہو؟"

— "نہیں، میں اس سے بالکل ناواقف ہوں"۔

یہ سنکر بڑھیا غصہ سے لال ہو گئی اور چیخکر بولی کہ "اے کمینے، اے منافق ادھر دیکھ میری آنکھ میں آنکھ ڈالکر کہہ کر تو مجھے نہیں پہچانتا۔ اے ذلیل کتے، کیا میں وہ دن بھول سکتی ہوں جب تو نے میرے اکلوتے بیٹے کو اس سردار سے قتل کرا کے میری دنیا کو ویران کر دیا۔

یہ سنکر انطاکی کی حیرانی کی انتہا نہ رہی اس نے پوچھا:-

"اے بڑھیا تو کون ہے، تیرا بیٹا کون تھا اور تو میرے رفیق پر کیوں یہ الزام قائم کرتی ہے"

بڑھیا — "اے انطاکی، مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں، کیونکہ تجھے تو دھوکا دیا گیا تھا، میں تو اس مکار سے مخاطب ہوں جسے تو اپنا رفیق کہتا ہے، ادھر میرے پاس آ اور اپنے رفیق کے کمینہ پن کی داستان تو بھی سن لے۔ میں ایک کاہنہ ہوں اور مسلسل چالیس سال سے ہیکلوں اور معبدوں میں گھوم پھر کر زندگی بسر کر رہی ہوں، مصر و فینقیا کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں کے لوگ مجھے نہ جانتے ہوں اور میری پیشین گوئیوں کو غلط باور کرتے ہوں، میرا ایک بیٹا تھا، اکلوتا بیٹا، جسے میں اپنے علم کے اسرار سکھا رہی تھی اور وہ تمام راز جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں اس کو بتا رہی تھی — ناگہاں اس کی نگاہ ایک نوجوان لڑکی پر پڑی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا، یہ لڑکی بھی اس سے مالوف ہو گئی اور دونوں میں نکاح کا عہد و پیمان ہو گیا۔ یہ دونوں لطف و مسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک اور شخص اس لڑکی کا نہیں بلکہ اس کی دولت کا خواہاں پیدا ہو گیا اور میرے بیٹے کی ہلاکت کا سبب بنا۔ وہ شخص یہی تیرا رفیق ہے، جو میرے سامنے اور تیرے پہلو میں کھڑا ہوا ہے"۔

انطاکی نے ہیتیو کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا یہ صحیح ہے" لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بڑھیا نے کہا کہ "اے انطاکی کیا اس کا یہ سکوت اس امر کا ثبوت نہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں تردید کا حوصلہ نہیں"

انطاکی — "پھر کیا ہوا؟"

بڑھیا — "اس کے بعد یہ ہوا کہ اسکندریہ میں یہ تیرے پاس پہونچا اور مخبری کی کہ مصریوں کی ایک جماعت تیرے خلاف سازش کر رہی ہے"۔

انطاکی — "یہ صحیح ہے لیکن وہ سازش کرنے والے میرے ہاتھ نہیں آئے"

بڑھیا - "ہاتھ کیا آتے جبکہ حقیقت کچھ نہ تھی اور یہ دغا باز صرف اس لئے جھوٹ بول رہا تھا کہ میرے بیٹے کو تیرے ہاتھ سے ہلاک کرا کے اس لڑکی کو حاصل کرے - پھر کیا تجھے یاد نہیں کہ اسی سازش کے الزام اور ملکہ سے محبت کرنے کے جرم میں تو نے میرے جوان بیٹے کے قتل کرنے کا حکم دیا - وہ چیخ چیخکر اپنی بے گناہی کا اعلان کر رہا تھا لیکن کوئی سننے والا نہ تھا، وہ آسمان و زمین کو گواہ بنا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا، لیکن اسکی بات کا یقین کرنے والا کون تھا - یہ مکار، منافق تجھے ابھار رہا تھا یہ کہکر کہ وہ سازش میں شریک ہے، تیری غیرت میں ہیجان پیدا کر رہا تھا یہ یقین دلا کر کہ وہ ملکہ سے محبت کرتا ہے اور ملکہ اُس سے، درانحالیکہ میرے بیٹے نے سوائے اُس ایک لڑکی کے کسی اور سے محبت کی ہی نہیں اور آخر کار اسی کی محبت میں اس نے جان دی -

پھر جس وقت تو نے قتل کا حکم دیا میں وہیں تھی، جس وقت جلاد کی تلوار نے میرے بیگناہ بیٹے کے سر کو تن سے جدا کیا میں وہیں موجود تھی - کیا تو سمجھ سکتا ہے کہ مجھ پر اس وقت کیا گزر رہی تھی تو کیا سمجھ سکتا ہے، تیرا بیٹا اگر کبھی تیرے سامنے اس طرح ذبح کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ اولاد کی محبت کیا چیز ہے اور دنیا میں ان ماں باپ سے زیادہ زہر آلود غم کسی کا نہیں جن کے اکلوتے بیٹے نے اُن کے سامنے دم توڑا ہو -

اس واقعہ کے بعد میں یہاں چلی آئی اور یہاں کے تاریک غاروں میں درندوں کے پاس حشرات کے ساتھ رہنا اختیار کیا اور اے انطاکی یقین کر کہ شقاوت میں وہ انسان سے کم اور عدل و انصاف میں اس سے زیادہ ہیں - خیر، یہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، لیکن اے انطاکی اب کاہنہ مصری کی وہ باتیں بھی سن لے جو تجھ سے متعلق ہیں -

ملکہ کلیوپیٹرا جسے تو عورت سمجھتا ہے حقیقتاً خدا کا عذاب ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اس سے چھو جانے کے بعد قسمت کے کوڑھ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے - کیا تجھے پامپیس کا حال معلوم نہیں، کیا تو سیزر کے حشر سے ناواقف ہے اور کیا تو اس سے بیخبر ہے کہ اس کی وجہ سے کتنے ملک ویران ہو گئے اور کتنی جانیں ہلاک، پھر ہوشیار ہو جا کہ آج کے بعد سے تجھے بھی کوئی مسرت و راحت نصیب نہیں ہونا، اور اس حال میں تجھے مرنا ہے کہ نہ تیرے دوست تیرے پاس ہوں گے نہ اہل وطن، نہ تیرے عزیز تیرے قریب ہوں گے اور نہ تیری وہ محبوب ملکہ جس کی محبت میں تو نے اپنے وطن سے غداری کرنے میں بھی دریغ نہ کیا - تیری لاش پڑی ہوگی اور اس پر کوئی آنسو بہانے والا نہ ہوگا، تو تڑپ رہا ہوگا اور کوئی ایک ہاتھ بھی تجھے سنبھالنے کے لئے آگے نہ بڑھیگا"

یہ کہکر اسنے اپنے لباس کے اندر سے چھپا ہوا خنجر نکالا اور خونخوار شیرنی کی طرح ہیتیو کی طرف جھپٹکر اسکے سینے میں ایسی سختی سے پیوست کر دیا کہ سانس لینے کی بھی مہلت نہ دی - خنجر اس کے دل کے اندر ڈوب گیا تھا - سینے سے خون کی دھار جاری تھی اور بڑھیا ایسی خوش تھی گویا دنیا کی دولت اس کے ہاتھ آ گئی ہے -

اس نے مبہوت و متحیر انطاقی سے مخاطب ہو کر کہا کہ:۔

"مجھے گمان بھی نہ تھا کہ کبھی میں اپنے بیٹے کے قاتل سے انتقام لے سکوں گی۔ اس لئے اے انطاقی میں تیری شکر گزار ہوں کہ اپنے ساتھ تو اس کو بھی لے آیا اور اس طرح میری زندگی کا تنہا مقصود پورا ہو کر رہا۔ اچھا اے ناعاقبت اندیش اندھے عاشق، اب میں تجھ سے رخصت ہوتی ہوں!! اس خائن کی لاش کو یہیں چھوڑ جانا کیونکہ آج رات میں نے یہاں کے بھیڑیوں اور گدھوں کو دعوت دی ہے اور جو کچھ میں نے تیرے متعلق کہا ہے اسے بھی یاد رکھنا، کیونکہ ممکن ہے پھر میں تجھ سے نہ مل سکوں"۔

یہ کہکر بڑھیا وہاں سے دفعتاً غائب ہو گئی اور انطاقی اسی طرح مبہوت و متحیر کھڑا رہا۔

پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے۔ انطاقی پر بعد کو ایک ایسا وقت آیا کہ اس نے خودکشی کرنا چاہی لیکن اس کی شجاعت نے اجازت نہ دی، اس نے جنگ کے دوران میں اپنے آپ کو موت کے منھ میں ڈال دیا لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ اور۔۔۔ پھر جب وہ مرا تو اس حال میں کہ نہ کوئی دوست پاس تھا، نہ عزیز، نہ کوئی رونے والا تھا، نہ اٹھانے والا۔ یہاں تک کہ کلیوپٹرا بھی اس سے دور تھی

یہ واقعہ ہے ۳۰ ؁ قبل مسیح کا۔

مکتوبات نیاز

دنیائے ادب و انشا میں بالکل نئی چیز

اس میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو نگار میں شائع نہیں ہوئے، کتاب مجلد، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر شائع ہوئی ہے اور جناب نیاز کا تازہ ترین فوٹو معہ ایک اصل خط کے بلاک کے بھی اس میں شامل ہے۔

قیمت علاوہ محصول ۱۲/ محصول ڈاک ۶/

مینجر نگار

باب المراسلۃ والمناظرہ

کسبی

آج اتفاق سے نگار بابت جون ۳۵ء نظر سے گزرا۔ فہرست مضامین میں سب سے زیادہ جس عنوان نے میری توجہ اپنی جانب کھینچی وہ "کسبی" تھا۔ چونکہ میں صاحب مضمون سے ایک حد تک موافق ہوں اس لئے اس پر مزید لکھنا نہیں چاہتی لیکن میرے پیش نظر اسوقت جناب اڈیٹر صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نگار میں اسی قسم کی تحریر پڑھ چکی تھی اور آج اسی تحریر نے مجھے یہ چند بے ربط جملے لکھنے پر مجبور کیا۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"مردوں کا اپنی بیویوں سے چھپکر زنانِ بازاری کی صحبت ڈھونڈھنا اکثر و بیشتر اسی بنا پر ہوا کرتا ہے کہ ان کے بعض ذوق گھروں میں پورے نہیں ہوتے اور وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی اس خواہشِ تفریح کو دوسری جگہ پورا کریں۔ یہ مسئلہ پیشہ ور عورتوں کو برا بھلا کہنے سے حل نہیں ہو سکتا البتہ اگر خود گھروں کی عورتوں میں ایسا سلیقہ پیدا ہو جائے کہ وہ مردوں کی رعایتِ ذوق کا لحاظ رکھ سکیں تو بیشک ایک حد تک ادارہ فحاشی کا انسداد ہو سکتا ہے"۔

معلوم ہوتا ہے قابل اڈیٹر صاحب نے یہ تحریر لکھتے وقت اپنی جنس کی فطرت کا پورے طور سے موازنہ نہیں کیا ورنہ آپ ہرگز یہ الفاظ لکھ کر فرقۂ اناث کو موردِ الزام نہ بناتے۔ میں نے بیسیوں ایسی مثالیں دیکھی ہیں جہاں بقول ڈیٹر صاحب "مردوں کی رعایتِ ذوق" کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کا انسداد نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر گھروں میں گھر کی حسین اور سلیقہ شعار بیوی پر ایک معمولی صورت شکل اور بھدے اخلاق والی عورت کو ترجیح دیجاتی ہے۔ شریف اور روشن خیال بیوی اس کے انسداد پر کمربستہ ہوتی ہے۔ جب شنوائی نہیں ہوتی تو رنج و غم میں گھلتی ہے طرح طرح کے

باغیانہ خیالات اس کے دل میں پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ بھولے پن سے سوچتی ہے کہ ایک بری عورت کا مرد براراستہ اختیار کرے یا ایک ناقابل بیوی سے شوہر برگشتہ ہو لیکن ایک شریف اور ہر طرح سے قابل شوہر بیوی کا خاوند کیوں ایسا راستہ اختیار کرے۔ وہ اسے مرد کا ظلم تصور کرتی ہے۔ انتقام پر آمادہ ہونا چاہتی ہے اس کے دل میں خطرناک خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ پائے استقلال ڈگمگانے کو ہوتا ہے کہ شرافتِ قدیمی قدم تھام لیتی ہے۔ عمدہ تربیت بُرے خیالات پر غالب ہوتی ہے اور وہ اپنے خیالات پر تاسف کرتی ہوئی آئندہ کو ان سے باز رہنے کی دعا کرتی ہے۔

اس کے سامنے اپنی جنس کی بے بسی اور کم مائیگی کا نقشہ کھنچ جاتا ہے جب بڑی بوڑھیاں اسے کہتی ہیں کہ "سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں" اب وہ الرجال قوامون کے صحیح مفہوم کو سمجھ لیتی ہے۔ تجربہ نے ایک نہیں بلا مبالغہ بیسیوں ایسی مثالیں دکھا دیں جہاں اندر ہی اندر بیویوں کا خون چوسا جاتا ہے اور وہ بیچاری اُف نہیں کرتیں آخر اپنے آپ کو ایک مجبور ناتوان ہستی سمجھ کر خاموش ہو رہتی ہیں۔ آخر ایسا نہ کریں تو کیا کریں۔

بعض بھائی عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے اسد رجہ خائف ہیں تو کیوں صرف اس لئے وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں خدانخواستہ پھر انھیں عورتوں کی طرف سے ترکی بہ ترکی جواب نہ ملے۔ اور انکی "تفریحات" میں خلل پڑے۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ عمدہ تربیت اور اعلیٰ عادات کی لڑکیاں اگر آزادی کی آخری حد تک بھی پہونچ جائیں تو بھی ان "تفریحات" کے خیال کو دل میں لانا گناہ سمجھیں گی جن کے آج کل قریب قریب سب بھائی عادی ہیں۔

میں جناب اڈیٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مردوں کو راہ پر لانے کے لئے مظلوم فرقہ کو تدبیر بتائی۔ لیکن وہ تدبیر ایک کسبی کے معاملہ میں ہے۔ مہربانی کر کے فرمایئے کہ اس عورت کے بارے میں وہ کونسی تدبیر کارگر ہوگی جو بیوی سے صورت شکل تعلیم اخلاق غرض ہر لحاظ سے کم درجہ ہو۔

(نگار) محترمہ، مجھے پورے طور پر اپنی جنس کی فطرت کا علم ہے اور میں اچھی طرح واقف ہوں کہ مرد، عورت پر ظلم کرنے میں کس قدر دلیر و جری واقع ہوا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ اس کا علاج صرف عورت ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مرد سے اس کی توقع رکھنا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے بالکل ایسا ہی ہے جیسے قزاق سے یہ امید رکھنا کہ وہ الحاح وزاری سے متاثر ہو کر قزاقی چھوڑ دے گا۔

سب سے پہلے آپ اس امر پر غور کیجئے کہ مرد اس باب میں کیوں اس قدر جری ہوا ہے۔ اس کا کھلا ہوا سبب

صرف یہ ہو کہ عورتیں اسکی دست نگر ہیں، محتاج ہیں، وہ اگر کھانے کو نہ دے تو بھوکی رہیں، پہنے کو نہ دے تو ننگی پھریں اور ظاہر ہے کہ ایسی بیدست و پا اور اس درجہ مجبور ہستی کیا اپنی وقعت قائم رکھ سکتی ہے اگر مرد یہ جان لے کہ بیوی اس کی محتاج نہیں ہے اسمیں خود اتنی اہلیت موجود ہے کہ وہ اس سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی بسر کر سکتی ہے تو قیامت تک اس کے اندر یہ جذبۂ انانیت پیدا نہیں ہو سکتا، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک دولتمند بیوی کا شوہر کتنا مطیع و فرمانبردار شوہر ہوا کرتا ہے اور ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے "جو اُن کو بُری لگے" اور اسکا "آزوقۂ شوہرانہ" بند ہو جائے۔

اسی طرح اُن تعلیم یافتہ عورتوں کے شوہروں کو لیجئے، جو ملازمت یا کسی اور پیشہ کے ذریعہ سے اپنی معاش خود حاصل کر رہی ہیں۔ یہاں بھی آپ کو "جبر شوہرانہ" کی کوئی مثال نظر نہ آئے گی ۔۔ الغرض یہ مسئلہ بالکل نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا ہے اور جب تک نفسیاتی طور پر اس کا علاج نہ کیا جائے گا، محض دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگنے یا بانی پی پی کر کوسنے کاٹنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

اگر عورتیں پوری تعلیم اور پوری آزادی حاصل کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں تو اُن کو صبر و شکر سے مردوں کے تمام مظالم برداشت کرنا چاہئے، اور انھیں کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ حرف شکایت زبان تک لائیں ۔۔ میں نے تعلیم کے ساتھ آزادی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یعنی اگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی پابستہ و پر شکستہ رہیں تو بھی کوئی نتیجہ نہ ہوگا، کیونکہ جب تک مرد کے احساس آزادی کے پندار کو اسی قسم کے احساس سے نہ توڑا جائے گا وہ کبھی گردن نہیں جھکائے گا۔

آپ نے یہ بالکل صحیح و درست لکھا ہے کہ مرد حسین و خوش سلیقہ بیویوں کو چھوڑ کر دوسری ایسی عورتوں سے ملتفت ہو جاتے ہیں جو نہ خوبصورت ہیں نہ سلیقہ مند۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ بیوی اپنی چیز ہے اور دوسری عورت پرائی ۔۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ کسی چیز کے ملجانے یا اس پر کامل اقتدار حاصل کر لینے کے بعد وہ اس کی طرف سے بے پرواہ ہو جایا کرتا ہے اور جو چیز دسترس سے دور ہے یا جس کے ہاتھ سے نکل جانے کا ہر وقت اندیشہ ہے اس کے لئے وہ بیتاب رہتا ہے ۔۔ ایک کسبی میں مرد کے لئے سب سے بڑی کشش یہی ہے کہ وہ اسکی نہیں ہے ۔۔ اُسوقت بھی نہیں ہے، جب وہ اس کے لئے یکسر "ہاں" ہوتی ہے۔ پھر بتائیے کہ آپ شریف بیویاں فطرتِ انسانی کی اس بدتمیزی کا کیا جواب اپنے پاس رکھتی ہیں۔

آپ کی کمزوری کا تو یہ عالم ہے کہ آپ خط میرے پاس بھیجتی ہیں اور اس میں اپنا نام اور پتہ تک درج نہیں کرتیں، آپ مردوں کی ستمرانیوں کا شکوہ کرتی ہیں اور یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ "اگر شریف لڑکیاں آزادی کی اخیر حد تک پہونچ جائیں تو بھی ان تفریحات کے خیال کو دل میں لانا گناہ سمجھیں گی جن کے مرد عادی ہیں"۔ ایسی صورت میں

آپ کیا توقع مداوا کی رکھ سکتی ہیں ۔۔ آپ یقیناً اپنے دل میں اس کو گناہ ہی سمجھیے لیکن خدا کے لئے زبان سے اظہار نہ کیجئے، جب تک مرد کو آپ یہ باور نہ کرا دیں گی کہ آپ بھی اسی کی طرح بالکل آزاد ہیں اور آپ بھی اُسکو اسی طرح جلا سکتی ہیں جس طرح وہ جلاتا رہتا ہے، اسوقت تک کبھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے گا۔ قیام محبت کے لئے سب سے ضروری چیز جذبۂ رقابت کا اشتعال ہے اور یہی وہ چیز ہے جو کسی بیوی یا غیر عورت کی محبت میں اُسے مبتلا رکھتی ہے۔ پھر اگر آج مرد کو اپنی بیویوں کی طرف سے بھی وہی بے اطمینانی پیدا ہو جائے جو دوسری عورتوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہے تو باور کیجئے کہ وہ کبھی گھر سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ لیکن نہ آپ ایسا کریں گی نہ مرد آپ کا ہو کر رہیگا تعلیم کے معنے یہ نہیں ہیں کہ عورتیں گھروں میں بڑے بڑے قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھا کریں، بلکہ اس کا حقیقی مقصود آزادی ہے۔ آزادی خیال کی، فکر و ضمیر کی، اور احساسِ خودداری۔ وہ خودداری جو انسان کو خود اپنی قوت پر اعتماد کرنا سکھاتی ہے ۔۔ اس لئے اگر عورتوں میں تعلیم کا رواج ہوا اور پردہ باقی رہا تو اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا، اسی طرح اگر پردہ ٹوٹا اور وہ بھی اس حد تک کہ آپ بازار سے جا کر کپڑا یا ترکاری خرید کر لے آئیں، تو بھی بالکل بے نتیجہ بات ہوگی، کیونکہ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو مرد کے جذبۂ رقابت میں اشتعال پیدا کر سکے ضرورت اس امر کی ہے کہ عورتیں پڑھیں اور بے پردہ ہو جائیں، بے پردہ ہوں اور سوسائٹی میں آزادانہ چلیں پھریں، ہنسیں بولیں، یہاں تک کہ مرد یہ محسوس کرنے لگے کہ جس نگاہ سے وہ غیر عورت کو دیکھتا ہے اسی نگاہ سے غیر مرد اس کی عورت کو بھی دیکھ رہا ہے۔ پھر دیکھئے کہ اس کی یہ بے پروائیاں کہاں چلی جاتی ہیں اور وہ کس درجہ بے چین ہو جاتا ہے۔ آپ اس پر یہ اعتراض کریں گی کہ مغرب کی عورت نے یہی زندگی اختیار کی تو کیا نتیجہ ہوا کہ یہاں کچھ اور ہو گا۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل صحیح و درست ہے، لیکن کم از کم آپ یہ تو ضرور محسوس کرتی ہوں گی کہ وہاں کی عورت اُن مصائب میں مبتلا نہیں ہے جن میں یہاں کی عورتیں گھری ہوئی ہیں۔ اگر مرد دوسری عورتوں سے ملتفت ہو کر بیوی کو پریشان کر سکتا ہے تو وہ بھی دوسرے مردوں سے مل کر اُس کو جلا سکتی ہے اور چونکہ وہ خود اپنی معاش حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اس لئے اُسے مطلق پرواہ نہیں ہوتی کہ مرد اگر اسے چھوڑ دے گا تو وہ کیا کرے گی اور یہی وہ آزادی ہے جس نے مردوں کی جابرانہ حکومت کا وہاں خاتمہ کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اخلاق اور علی الخصوص ایشیائی اخلاق کے نقطۂ نظر سے عورتوں کی یہ بیباکی نہایت مذموم بات ہے اور شریف لڑکیاں کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتیں، اس کا کیا علاج کہ جس سوسائٹی نے یہ اُصول اخلاق وضع کئے ہیں وہ مرد کی اس بیہودگی کو اتنا معیوب نہیں سمجھتی اور عورت کی عدم وفاداری پر داستان کی داستان اور دیوان کے دیوان طیار ہو جاتے ہیں۔ پھر سوسائٹی کی یہ ناجائز رواداری یا دشمنی جو فی الحقیقت مرد ہی کے احساس تفوق کی پیدا کی ہوئی چیز ہے، اگر دور ہو سکتی ہے تو اس طرح نہیں کہ مرد سے التجا کی جائے یا اس کے جذبۂ رحم و کرم

کو ابھارا جائے، بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ عورت، مرد کے اس پندار کو فنا کرے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ مرد کی غلامی سے آزاد ہوجائے اور مرد کو یہ باور کرادے کہ وہ اس کی محتاج نہیں ہے۔

اول تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ عورت آزاد ہونے کے بعد لازماً اخلاقی پستی میں مبتلا ہوجائیگی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کرلیں کہ اخلاق پر یقیناً اثر پڑنا ضروری ہے اور آوارگی میں اضافہ ہونا لازم تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اگر چند نفوس کی قربانی سے کسی جماعت کے اکثر افراد کو فایدہ پہونچتا ہے تو اس قربانی کو گوارا کرنا چاہئے۔

بہرحال ہندوستان میں مرد عورت کے باہمی تعلق کا مسئلہ اب اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس کے لئے کسی جدید نظریہ کے وضع کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ زمانہ فیصلہ کرچکا ہے کہ جب تک عورت آزاد ہوکر میدان عمل میں نہ آئیگی وہ ہمیشہ ایسی ہی ذلیل بنی رہیگی اور اگر کسی قوم یا جماعت کی عورتیں اس فیصلہ پر عمل کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں تو ان کو کوئی حق شکوہ و شکایت کا نہیں ہے۔ نہ مذہب کا واسطہ دلانے سے کام چل سکتا ہے، نہ اخلاق کی دہائی دینے سے ۔۔ مرد برابر اسی طرح ظلم کرتا رہیگا اور عورت کو برداشت کرنا پڑے گا۔

محبوب عاشق کے قدموں پر
ہدیہ میں عظیم الشان رعایت

عمل سفلی عہ ہر مذہب والا عامل بن سکتا ہے مسلمان کیلئے مناسب نہیں عمل علوی عہ صرف مسلمانوں کیلئے مخصوص ہیں کامل ۲۰ سال کا تجربہ ہے کبھی سر مو خطا نہیں کئے جب تلاش تھی ہزاروں روپیہ برباد کئے اب میں خدا کو حاضر و ناظر جانکر بے کم و کاست قلیل ہدیہ پر ان کا اعلان کرتا ہوں تاکہ سب امیر و غریب فائدہ اٹھا سکیں۔ جن بھائیوں کو میری گزارش پر اعتبار ہو اور ساتھ ہی ایک حلفنامہ اس اقرار کا ارسال کریں کہ اپنی ذات کے سوائے کسی دوسرے کو نہ بتائیں گے طلب فرمائیں عمل عہ اس عمل کے پڑھنے میں صرف پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں اس کا عامل ایک سال اس پر قابض رہتا ہے دوسرے سال کے لئے پھر دوبارہ پندرہ منٹ صرف کرکے عمل پڑھنا ہوتا ہے اسی طرح تمام عمر اس سے کام لیا جاسکتا ہے ہدیہ عہ عمل علوی عہ یہ ایک آیت قرآنی باموکل کا عمل ہے اسم سیاہ مرچوں پر اسم ۔اسم مرتبہ پڑھی جاتی ہے، دن میں انشاء اللہ مطلوب آپکے قدموں پر سرنگوں ہوگا ہدیہ صرف عہ عمل عہ برائے ترقی روزگار یہ عمل ترقی تجارت ترقی معاش ملازمت اور ہر قسم کی ترقی کے لئے عجیب و غریب عمل ہے ہفتہ میں صرف چہار شنبہ کو پڑھا جاتا ہے۔ پڑھنے میں صرف آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے اسکی برکت سے روزی روزگار میں اسقدر ترقی ہوتی ہے کہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ نظر آتا ہے عہ نذرانہ ہے عہ میں صرف دس آدمی پڑھنے کی اجازت لے سکتے ہیں عمل عہ عداوت یہ عمل دو شخصوں کے درمیان عداوت ڈلوانے کے لئے مجرب ہے۔ جائز ضرورت کیلئے طلب کیا جائے ورنہ گنہگار ہوں گے ہدیہ عہ عمل عہ یہ عمل دشمن کی تباہی و بربادی کے لئے بہترین ہے، جائز ضرورت کیلئے طلب کیا جائے ہدیہ عہ، ان تمام عملوں میں کسی قسم کا خوف نہ خطرہ نہ اپنے مکان سے کہیں باہر جانے کی ضرورت۔ عمل بذریعہ وی پی طلب کریں یا منی آرڈر ارسال کریں بذریعہ رجسٹری عمل ارسال کئے جائیں گے۔ **فضل شاہ عامل گلی راجان دہلی**

باب الاستفسار

سیرۃ نبوی ۔ توحید ۔ مذہب حنیفی

(جناب محمد اسلم صاحب ۔ اکبر پور)

مندرجۂ ذیل سوالات پر اظہار رائے چاہتا ہوں :۔

(۱) سیرۃ نبوی کے مطالعہ کا بہترین ذریعہ کیا ہے اور موجودہ کتب سیر میں کس پر اعتماد کلی ہوسکتا ہے۔

(۲) کیا درس توحید صرف اسلام کی خصوصیت تھی اور اُس سے قبل یہ تعلیم کسی نے نہیں دی۔

(۳) مذہب حنیفی سے کیا مراد ہے۔

(نگار) ایک انسان کی سیرت کے دو حصے ہوا کرتے ہیں، ایک کا تعلق تاریخ وجغرافیہ سے ہے اور دوسرے کا نفسیات سے۔ یعنی ایک تو اس تحقیق سے متعلق ہے کہ وہ کب پیدا ہوا، کب مرا، دوران حیات میں اس نے کیا کیا، کہاں کہاں رہا اور دوسرے یہ کہ اس کا نفسیاتی میلان کیا تھا اور اسکے زندگی کے کن واقعات سے ہم اسکے طبیعی رجحان کا پتہ چلا سکتے ہیں۔

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر جس وقت ہم سیرۃ نبوی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک حصہ پر تو بحث کے یقینی ذرایع موجود ہیں، لیکن اُس کے دوسرے حصے کی نسبت اختلاف ہوسکتا ہے اور ہے۔

رسول اللہ کا نفسیاتی میلان کیا تھا، فطرت کی طرف سے وہ کیا رجحان لیکر آئے تھے، آپ کا ذہنی ودماغی اقتضاء کیا تھا، اس باب میں نہ کتب تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور نہ احادیث کی ورق گردانی کی، کیونکہ قرآن پاک سامنے موجود ہے اور اس کے ایک ایک لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا نصب العین کسقدر بلند آپ کا خلق کتنا پاکیزہ اور آپ کا عزم کسدرجہ راسخ ومستحکم تھا۔ اگر آج دنیا سے اسلامی تاریخ وسیر کی تمام کتابیں نیست ونابود ہوجائیں تو بھی سیرۃ نبوی کی ان خصوصیات کے ثابت کرنے کے لئے قرآن پاک کے اوراق کافی ہیں، البتہ آپ کی سیرۃ کا دہ

حصہ جو اقوال و افعال کی جزئیات یا معیشت و معاشرت کی تفصیلات سے متعلق ہے، کامل تحقیق و یقین کے ساتھ مرتب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے لئے ہم کو احادیث و کتب تاریخ کی جستجو کرنا پڑے گی اور یہ دونوں ذریعے زیادہ موثق نہیں ہیں، کیونکہ احادیث کا بہت کم حصہ قابل اعتبار ہے اور تاریخ کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی موجود نہیں جو آپ کی زندگی میں یا اس کے بعد ہی مرتب کی گئی ہو۔

احادیث کا حصہ کیوں قابل اعتبار نہیں۔ اس کے نسبت ہم بارہا نگار کے صفحات میں اظہار خیال کر چکے ہیں، اس لئے تکرار کی ضرورت نہیں، البتہ تاریخی حیثیت سے جو کتابیں لکھی گئیں ان کا ذکر اس جگہ ضروری ہے۔ رسول اللہ کی زندگی تین زمانوں میں تقسیم ہے۔ ایک زمانہ ولادت سے بعثت تک، دوسرا بعثت سے ہجرت تک اور تیسرا ہجرت سے وفات تک۔

چونکہ آپ کی بعثت ۴۰ سال کی عمر میں ہوئی اس لئے ظاہر ہے کہ عمر کا بڑا حصہ تو اس حال میں گزرا کہ اس کی طرف لوگوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ یہ کس کو معلوم تھا کہ یہ امی آئندہ چلکر اتنا بڑا دعویٰ کرنے والا ہے، رہگیا زندگی کا دوسرا دور سو وہ چونکہ انتہائی کشمکش، حد درجہ پریشانی و اضطراب اور حالت امید و بیم میں بسر ہوا، اسلئے جو چند معاون و انصار آپ کے پیدا ہو گئے تھے ان میں بھی یقین کامیابی کا نہ تھا کہ وہ رسول اللہ کے مستقبل میں کسی خاص اہمیت کا اندازہ کرکے اُن کے ذاتی حالات و کوائف کی طرف توجہ کرتے۔ البتہ ہجرت کے بعد جو زمانہ آیا وہ بیشک کامیابی کا دور تھا جس نے رسول اللہ کی رسولانہ حیثیت کو مستحکم کر دیا اور چونکہ وہ بھی صرف لڑائیوں ہی میں بسر ہوا تھا اس لئے سب سے پہلا تاریخی مواد بھی ہم کو "مغازی" ہی کا ملتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی خالص تاریخی نقطۂ نظر کو سامنے نہیں رکھا گیا اور اس کی حیثیت بھی "ایام عرب" کی اُس بطل پرستانہ لٹریچر کی سی ہے جو بعثت نبوی سے قبل جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی اولین فتوحات کے بعد ہی عرب کے پیشہ ور قصہ خوانوں نے (جنھیں وہاں قُصّاص کے نام سے موسوم کرتے تھے) تمام اسلامی دنیا میں یہ رزمیہ داستانیں بیان کرنا شروع کر دیں اور ان میں رسول اللہ کی ہستی کو جنھوں نے اپنے آپ کو صرف " انا بشر مثلکم " کی حیثیت سے پیش کیا تھا اسی رنگ میں ظاہر کیا جو انجیل کی روایات اور ایرانی افسانوں میں پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ آپ کے واقعات زندگی نہ صرف ولادت یا بعد ولادت کے بلکہ اس سے قبل کے بھی گھڑ کر مشہور کئے جانے لگے۔ چنانچہ نور محمدی کا پیدا کیا جانا، ارواح انبیاء اور جن و ملک کا اس کو سجدہ کرنا، ہزاروں سال تک اس کا طیور فردوس کے پوٹوں میں رہنا اور پھر بہت سے پیمبران عظام سے صلباً بعد صلب منتقل ہو کر جناب آمنہ کے شکم مبارک میں آنا، ولادت کے وقت ایوان کسریٰ کا جنبش میں آجانا، بتوں کا اوندھے منھ گر جانا، فرشتہ کا آپ کے سینہ کو چاک کرکے دل کو آلایش سے پاک کرنا، پشت پر مہر نبوت

ہونا، آپ کے سایہ کا معدوم ہونا، ہاتھ میں کنکریوں کا بولنا، استن حنانہ کا آپ کے فراق میں رونا، چاند کے دو ٹکڑے کر دینا، ہر مجمع میں آپ کا سب سے بلند نظر آنا، جنگ میں فرشتوں کے پرے کے پرے امداد کے لئے آنا وغیرہ وغیرہ سیکڑوں باتیں اس قسم کی مشہور کی گئیں جس سے مقصود یہ تھا کہ یہود، نصاریٰ اور اہل ایران کے لٹریچر میں جو عجیب و غریب روایات ان کے اکابر کے متعلق پائی جاتی تھیں، اسلامی روایات کسی طرح اُن سے کم نہ رہیں۔ اکابر پرستی کا یہ جوش ہمیشہ ہر قوم میں اس طرح کا لٹریچر فراہم کر دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام بھی اس سے خالی نہ رہا۔ لیکن فرق اتنا ہوا کہ اسلام میں یہ لٹریچر اسی جگہ ختم ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ اس نے بعد کو ایک اور انداز اختیار کیا جسے داستان گوئی اور تاریخ کی ملی جلی صورت کہنا چاہئے اور جس کا بہترین نمونہ وہب بن منبہ کی کتاب المغازی ہے۔

مدینہ میں سیرۃ رسول کے مطالعہ و تدوین کی طرف خاص توجہ کی گئی اور غالباً عروۃ بن الزبیر (۲۳ - ۹۴ھ) سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے اسے تاریخ کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی انھوں نے سیرۃ نبوی کے متعلق بہت سی روایتیں فراہم کیں اور اس طرح گویا سیرۃ و حدیث دونوں کو ملا کر ایک ایسے فن کی بنیاد ڈالی جسے صحیح معنے میں بیاگرفی تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس کی داغ بیل ضرور کہنا چاہئے۔

اسی طرح حضرت عثمان غنی کے صاحبزادہ ابان نے بھی مکہ میں بیٹھکر سیرۃ نبوی کے متعلق فراہمی روایات کا کام شروع کیا جنھیں ان کے شاگرد عبدالرحمان بن المغیرہ نے کتابی شکل میں منتقل کیا۔ اور یہ کام ایک مستقل فن کی حیثیت سے علم المغازی کہلاتا تھا جس نے نہ صرف مکہ و مدینہ بلکہ بصرہ میں بھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کر لی تھی۔

عروۃ کے شاگردوں میں زُہری پہلے شخص تھے جنھوں نے رسول اللہ کی سیرۃ کو مغازی کے رنگ سے کچھ ہٹکر پیش کیا تھا اور اگر وہ کتاب باقی رہتی تو ممکن ہے سیرۃ کی کتابوں میں جو روایتی مبالغے پائے جاتے ہیں وہ اتنے نہ ہوتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ابن اسحاق نے جو زہری کے شاگرد تھے ضرور اپنے اُستاد کی اس کتاب سے فائدہ اُٹھایا ہوگا اور انھوں نے جو سیرۃ رسول مرتب کی تھی اس میں علاوہ خود اپنی تحقیقات کے زہری کے مجموعہ سے بھی استفادہ کیا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ ابن اسحاق کی کتاب بھی پوری محفوظ نہ رہ سکی اور اگر ابن ہشام نے اُن کے اقوال اپنی سیرۃ رسول میں نقل نہ کئے ہوتے تو ہمارے پاس کوئی ذریعہ اس سے استفادہ کا نہ تھا۔ زُہری کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا ابن اسحاق کا ۱۵۱ھ میں اور ابن ہشام کا ۲۱۳ھ میں۔ اس لئے یہ کہنا غالباً درست نہ ہوگا کہ ہر چند سیرۃ نگاری کی ابتدا ۲۳ھ میں ہو چکی تھی لیکن اس کی پوری تشکیل دوسری صدی ہجری کے آخر میں ہوئی اور سب سے زیادہ قدیم و معتبر کتاب اس موضوع پر ابن ہشام کی ہے۔

ابن ہشام نے اس موضوع پر بہت متنوع و کثیر اطلاعات فراہم کی ہیں اور ہر چند بہ لحاظ درایت یا اسناد اُنکی جمع کی ہوئی تمام روایات قابل اعتماد نہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ سیرۃ نبوی پر سب سے پہلی کتاب جسے بیاگرفی

کہہ سکتے ہیں، ابن ہشام ہی کی ہے۔ اسی عہد کے ایک دوسرے مورخ محمد عمر الواقدی ہیں (جن کا انتقال ۲۰۷ھ میں ہوا) جنھوں نے سیرۃ نبوی کی خدمت تین طریقوں سے کی ہے ایک کتاب المغازی کے ذریعہ سے، دوسرے سیرۃ لکھ کر اور تیسرے طبقات کی تالیف کر کے اور ہر چند یہ تینوں تصانیف مگر نہایت بسیط سیرۃ بنتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تنقیح روایات صحت اسناد اور نقد روایت کے لحاظ سے علامۂ واقدی کا یہ کارنامہ ابن ہشام کی تصنیف کو نہیں پہونچتا۔

اس کے بعد صدیوں تک اس موضوع پر کسی نے توجہ نہیں کی اور اس کے بعد بھی جو کچھ جس نے لکھا اس کا ماخذ ابن ہشام اور واقدی ہی کی تصانیف تھیں۔ یہ تو حال ہوا عربی کی کتابوں کا۔ اب رہ گئیں وہ تصانیف جو اردو میں کی گئیں، سو ان کا ذکر فضول ہے کیونکہ ان میں سے اکثر تو اس قابل بھی نہیں کہ انھیں سیرۃ کے نام سے منسوب کیا جائے اور جو چند ہیں وہ بھی نقائص سے پاک نہیں۔ حد یہ ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ نبوی جس کی ابتدا مولانا شبلی نے کی تھی اور اختتام سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں ہوا ہے وہ بھی اس قابل نہیں کہ اسے صحیح معنے میں بیاگرفی کہہ سکیں کیونکہ اس میں بھی بکثرت غیر منقح روایات سے استناد کیا گیا ہے اور دور از عقل و خلاف حقیقت باتوں کی کمی نہیں۔

انگریزی میں یقیناً بعض تصانیف بیاگرفی کے اصول پر لکھی گئی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے مصنفین اس دشمنی سے اپنے دل کو صاف نہ کر سکے جو اسلام اور بانی اسلام کے ساتھ ان کو چلی آ رہی ہے۔ الغرض مسلم و غیر مسلم مصنفین میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے پوری طرح دیانت و امانت سے کام لیکر اس خدمت کو انجام دیا ہو۔ درانحالیکہ ایک مورخ یا سیرۃ نگار کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حسن اعتقاد و تعصب دونوں سے پاک ہو۔

دین حنیف جیسے آپ کہتے ہیں، وہی ہے جس کا دوسرا نام دین ابراہیمی ہے اور رسول اللہ سے قبل بھی اہل عرب اپنے مورث اعلیٰ جناب ابراہیم اور ان کے عقیدۂ توحید سے واقف تھے۔ ابن ہشام نے بہ حوالۂ ابن اسحاق ان موحدین و مصلحین کے سلسلہ میں ورقہ ابن اسد، عبید اللہ ابن جحش، عثمان ابن الحویرث اور زید ابن عمر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ لوگ دین حنیف کے پابند تھے اور اس کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔

زید ابن عمر نے اپنے عقاید توحید کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

ارباً واحداً ام الف رب ادین اذا تقسمت الامور

عزلت اللات والعزیٰ جمیعا کذلک یفعل الجلد الصبور

لفظ حنیف عبرانی سے لیا گیا ہے، وہاں اس کے معنے "چھپانے والے، جھوٹ بولنے والے اور منافق" کے ہیں اور ایام جاہلیت میں وہ لوگ جو بتوں کی پرستش کے خلاف تھے انھیں طعن و تعریض کی صورت سے حنیف کہا کرتے تھے۔ یعنی وہ لوگ، جو راہ راست سے ہٹکر گمراہ ہو گئے ہیں۔ لیکن چونکہ موحدین کے نزدیک یہ گمراہی عین مقصود تھی اس لئے خود انھوں نے بھی اس نسبت کو اپنے لئے گوارا کر لیا اور رفتہ رفتہ لفظ حنیف کا مفہوم ہی موحد غیر بت پرست قرار پا گیا۔

مطبوعات موصولہ

تفسیر قرآن حصہ اول مولفہ پادری جے۔ علی بخش صاحب لاہور، جس میں صرف مکی سورتوں کو یکجا کرکے ان کی شان نزول ظاہر کی ہے اور صحف مقدسہ کے بیانات سے ان کو مطابق کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ تفسیر ایک ایسے صاحب کی لکھی ہوئی ہے جو مشنری سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا مقصود سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن کو انجیل و توریت ہی کا دوسرا ماخذ ثابت کریں اور چونکہ قرآن کا اسرائیلی حصہ تقریباً وہی ہے جو انجیل و توریت میں پایا جاتا ہے اس لئے ایک شخص کو ایسا کہنے میں زیادہ تامل بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کتاب کی ترتیب بہت اچھی ہوئی ہے اور انداز بیان بھی شگفتہ نہیں ہے، تاہم اس لحاظ سے کہ ایک عیسائی انتہائی رعایت کے بعد قرآن مجید کے متعلق کیا کہہ سکتا ہے، اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا مسئلہ اسوقت تک لاینحل پڑا ہوا ہے، اور جبکہ خود مسلمانوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی، ہم ایک غیر مذہب والے سے کیا شکایت کر سکتے ہیں۔ اسوقت جتنی تفاسیر کلام مجید کی پائی جاتی ہیں وہ سب عہد حاضر کے اقتضاء کے خلاف ہیں اور ضرورت ہے کہ ایک ایسا شخص اس کی تفسیر لکھے جو سرے سے مذاہب کا مخالف ہو یا پھر یہ کہ تمام مذاہب سے ہمدردی رکھتا ہو مگر مسلمان نہ ہو۔

قرآن مجید کو احادیث کے ذریعہ سے سمجھنے کا مسئلہ ایسا پیچیدہ ہے کہ جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے اس کی تفسیر بیکار ہے اور ظاہر ہے کہ قدامت پرست مسلمان اس کا فیصلہ کرنے کے لئے طیار نہیں ہو سکتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ الہام و وحی یا کلام مجید کے کلام الٰہی ہونے کی حقیقت کو بھی پہلے ظاہر کر دیا جائے، لیکن اسمیں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ جو شخص اس باب میں آزادی سے رائے دے گا وہ اسلام سے خارج سمجھا جائیگا اور اسلام سے خارج ہونے والے کی لکھی ہوئی تفسیر مسلمانوں کے نزدیک ایک ایسی مکروہ و مردود چیز ہے کہ اسکو چھونا بھی حرام ہے چہ جائیکہ اس کو پڑھکر اس کے حسن و قبح پر حکم لگانا۔

قرآن مجید کی جس خصوصیت کا میں قایل ہوں، وہ یہی ہے کہ مخالفانہ نقد و نظر کے بعد بھی اس کی اہمیت جوں کی توں باقی رہتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ تقلید و روایات کے پابند علماء نے اس کی اس خصوصیت کو

پوشیدہ کر کے ایسی صورت سے اسے پیش کیا کہ سوائے مسلمانوں کے ۔۔ اور مسلمان بھی وہ جو صرف معجزہ و خرق عادات کو مذہب سمجھتے ہیں ۔۔ کوئی اور اس کے مطالعہ سے فایدہ نہیں اٹھا سکتا۔

بہرحال پادری صاحب کی یہ کوشش اچھی ہو یا بری ہم کو گوارا ہی کرنا پڑے گی کیونکہ ہم خود کوئی چیز اس سے بہتر اپنے پاس نہیں رکھتے۔

اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور پادری صاحب سے ۵۳ ۔ گوالمنڈی لاہور کے پتہ پر ملسکتی ہے۔

منتخب افسانے مجموعہ ہے ۳۸ افسانوں کا جنھیں مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے غیر زبانوں سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمہ کی شان چونکہ اخذ و اقتباس کی ہے اس لئے عبارت کا تسلسل اور بیان کی سادگی وہی ہے جو اُردو داں حضرات کو مرغوب ہو

یہ افسانے ملک کے مشہور جراید و رسایل میں شایع ہو کر کافی شہرت و قبول حاصل کر چکے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ نہ صرف زبان و انشار بلکہ تنوع مطالب کے لحاظ سے بھی یہ مجموعہ مطالعہ کے قابل ہے۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ملک کے مشاہیر اہل قلم میں سے ہیں اس لئے ترجمہ یا زبان کے متعلق اظہار رائے بیکار ہے۔ پھر سب سے بڑی خصوصیت ایک یہ ہے کہ قیمت بہت کم یعنی صرف ایک روپیہ رکھی گئی، کتابت طباعت پسندیدہ ہے اور کاغذ دبیز۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۴۰۵ صفحات کو محیط ہے ۔۔ منیجر ہند بک ایجنسی کلکتہ یا تاج کمپنی لاہور سے یہ مجموعہ دستیاب ہو سکتا ہے۔

شکار اُردو میں پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر اتنی جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہے اس کے مصنف نواب قطب یار جنگ مرحوم ہیں، جن کی ساری عمر اسی مشغلہ میں بسر ہوئی۔

اس کتاب میں مصنف نے صرف دوسروں کے تجربات سے فایدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود اپنے تجربات کو سامنے رکھ کر تمام ان مسایل سے بحث کی ہے جو کسی نہ کسی طرح شکار سے تعلق رکھتے ہیں۔

طیور و وحوش سبھی کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے، لیکن شیر کی نسبت جتنا اور جو کچھ لکھا ہے وہ گویا ان کی ساری کوششوں کا ماحصل ہے، انداز بیان نہایت دلچسپ ہے اور وہ لوگ جو شکار سے دلچسپی نہیں رکھتے اُن کے لئے بھی اس کا مطالعہ نیچرل ہسٹری کے طور پر فایدہ سے خالی نہیں۔ اس کی قیمت دس روپیہ ہے جو اسکے محاسن و خصوصیات کے لحاظ سے کسی طرح زاید نہیں اور مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے ملسکتی ہے۔

دیوان مومن معہ شرح مومن کو جو مرتبہ تغزل میں حاصل ہے وہ کم از کم ناظرین نگار سے مخفی نہیں لیکن اس حقیقت کا علم اُن کو نہ ہوگا کہ دیوان مومن جو عام طور پر بازار میں ملتا ہے وہ اغلاط سے پُر ہے اور سخت ضرورت تھی کہ کوئی صاحب ذوق اس کا صحیح نسخہ مرتب کر کے شایع کرے۔

اس لئے ملک کو شکر گزار ہونا چاہئے جناب ضیا احمد ضیا ایم۔ اے کا جنھوں نے متعدد مختلف نسخے جمع کرکے ایک صحیح اڈیشن اس کا شائع کیا اور اسی کے ساتھ اس کے مشکل اشعار کی شرح بھی فٹ نوٹ میں دیدی۔

ابتدا میں مقدمہ کے طور پر مومن کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے جو دیکھنے کی چیز ہے۔ فاضل مولف کو مومن کے ساتھ خاص شغف حاصل ہے چنانچہ وہ اس سے قبل اس کے قصاید کا مجموعہ بھی اسی شان کے ساتھ شایع کر چکے ہیں۔

دیوان میں مومن کی تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے اور عمدہ کاغذ پر مجلد شایع کیا گیا ہے۔ قیمت ڈھائی روپیہ ہے اور شانتی پریس الہ آباد سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

روح الاسلام جناب عبید اللہ خاں صاحب قدسی پروفیسر فارسی سناتن دھرم انٹر کالج بیاور نے تصوف و اخلاق کی مختلف کتابوں سے اسلام کی اصل روح کو اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

جتنی اچھی باتیں اس کتاب میں درج کی گئی ہیں وہ یقیناً تعلیمات اسلام میں داخل ہیں لیکن ان کو صرف اسلام کی خصوصیت کیوں سمجھا جائے۔ جبکہ تمام دنیا کے مذاہب نے یہی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی۔ اسوقت ایسی کتابوں کی ضرورت نہیں جو ہمارے دماغوں کو صرف فلسفہ میں الجھائے رکھیں بلکہ عملی روح پیدا کرنے والی تصانیف درکار ہیں، جو کیمیائے سعادت اور مذاق العارفین کی فضا سے علحدہ کسی اور فضا میں طیار ہوا کرتی ہیں۔

اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مولوی فضل اللہ خانصاحب بیاور سے ملسکتی ہے۔

سلسبیل مجموعہ ہے جناب آل احمد صدیقی سرور ایم۔ اے کی نظموں کا۔ جناب سرور مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہیں اور شعر و سخن کا نہایت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔

اس مجموعہ میں چند نظمیں کشمیر کے دلکش مناظر سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں اور چند اور مختلف تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ ایک طویل نظم مولانا محمد علی مرحوم کے متعلق ہے اور آخر میں چند غزلیں بھی ہیں۔ سرسری نگاہ سے دیکھنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں، وہ یہ ہے کہ سرور صاحب مستقلاً شعر کہنے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن اگر کبھی یہ ارادہ کر لیا تو ان کا شمار ملک کے اچھے شعراء میں ہوگا۔ وہ اس لئے کہ اگر شوق شاعر کہلانے کا ہوتا تو ابھی وہ یہ مجموعہ شایع نہ کرتے اور یہ اس لئے کہ جب وہ ابتدا ہی میں ایسی اچھی نظمیں کہہ سکتے ہیں تو مشق کے بعد جو تم بھی کریں کم ہے۔

اس مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ سے ملسکتا ہے۔

بایو کیمک سائنس ڈاکٹر کاشی رام صاحب کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے جو سائکلوپیڈیا آف ہومیو پیتھک ڈرگس کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اس میں بایو کیمک دواؤں کے علامات بتا کر علاج و امراض اور تشخیص ادویہ پر نہایت جامعیت سے بحث کی ہے۔

ہر چند بایو کیمک سائنس، ہومیوپیتھی کی طرح وسیع و مکمل نہیں ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ بعض صورتوں میں یہ دوائیں بھی اکسیر کا کام کرتی ہیں۔ چونکہ اس سائنس میں صرف بارہ دواؤں سے تمام امراض کا علاج کیا جاتا ہے اس لئے یہ علم نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ یہ کتاب ایک روپیہ آٹھ آنے میں بھارت ہومیو فارمیسی لکھنؤ سے ملسکتی ہے۔

تعلقات ہومیوپیتھک ادویہ یہ تالیف بھی ڈاکٹر کاشی رام صاحب کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کونسی دوا کس کی معاون ہے اور کون کس کی ضد۔ یعنی کس دوا کے بعد کیا دینا چاہئے اور اگر کسی دوا نے مضر اثرات پیدا کئے ہیں تو ان کو کس دوا سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور یہ بھی بھارت فارمیسی لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

نغمۂ بیداری مسدس ہے جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کا جس میں انہوں نے پورے جوش و ولولہ کے ساتھ مسلمانوں کو درسِ عمل دیا ہے۔ زبان صاف ہے اور انداز بیان پُر زور قیمت دو آنے ہے اور ملنے کا پتہ نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں۔

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اسوقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بکثرت نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے نزلہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جلد پر دانے پڑ کر زخم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کر جاتا ہے ہلاکتیں بھی ہو جاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے ـــ ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی اور زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی ـــ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر ان کی چمک اور مضبوطی کو بھی قائم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے نہیں آنے دیتا ـــ قیمت علاوہ محصول ایک بکس ۹ر ـــ ایک شیشی میں محصول ۶ر صرف ہو جاتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کی جائیں گی اتنا ہی فائدہ ہوگا ـــ ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں ـــ کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے ـــ

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

شیاما کے انتظار میں

پھر آج شب کی دیوی، جادو جگا رہی ہے
مدہوشیوں پہ دنیا ایمان لا رہی ہے
پھر چاندنی چلی ہے، مہتاب کی جبیں سے
نغمے برس رہے ہیں، تاروں کی سرزمیں سے
پیمانۂ نظر میں، پھر مے اُتر رہی ہے
صہبا اثر ہوا پھر بدمست کر رہی ہے،
بیدار ہے محبت، ہشیار ہیں نگاہیں
پھر مسکرا رہی ہیں، عشرت کی جلوہ گاہیں
سو بجلیاں لئے ہے، ہر حورِ کہکشانی،
تصویر بن رہی ہے، ناہید کی جوانی
پھر کیفیت نظر میں، محسوس ہو رہی ہے
پھر محویت ہے طاری، پھر روح کھو رہی ہے
یہ اس لئے کہ شیاما ملنے کو آ رہی ہے
پھر دل کی ہر تمنا، تالی بجا رہی ہے

حسنِ تمام بنکر آئے گی آج شیاما
احساسِ عاشقی پر چھائے گی آج شیاما

نظروں میں مسکرائے، پھر آئے میری شیاما
میری نظر پہ صہبا، برسائے میری شیاما
لیکن میں اس سے پہلے، دنیا نئی بنا لوں
میں آج اپنے گھر کو انوار سے سجا لوں
تاروں سے نور لاؤں، مہتاب سے شعاعیں
کشمیر سے فضائیں، فردوس سے ہوائیں
شامِ اودھ سے لاؤں، شامِ اودھ کی باتیں
کاشی سے صبح لاؤں، اور مالوے سے راتیں
میں آج اپنے گھر کو ایوانِ نور کر دوں
دنیا میں آج پیدا، ایک اور طور کر دوں
بیٹھوں میں گھر میں، گھر کا پروردگار بنکر
ہر شوق و آرزو کا، آئینہ دار بنکر
یہ اس لئے کہ شیاما ملنے کو آ رہی ہے
پھر دل کی ہر تمنا تالی بجا رہی ہے

حسنِ تمام بنکر آئے گی آج شیاما
احساسِ عاشقی پر چھائیگی آج شیاما

فطرت واسطی

غزل

بہار آئی جو گلشن میں بہ قدرِ اعتبار آئی
گلوں کے خندۂ بیہم پہ شبنم اشکبار آئی

خدا جانے یہ میرے آبِ گل میں ہاتھ کسکا ہے
کہ گریہ بے قرار آیا ہنسی بے اختیار آئی

تصور بھی بہ قدرِ ذوقِ دل سب کچھ ہی ہستی میں
قفس میں یادِ گل آئی میں یہ سمجھا بہار آئی

نہ تھا منظور جو مجھ کو جلا کر خاک کر دینا
یہ عمرِ چند روزہ بن کے کیوں برق و شرار آئی

گیا تھا شوقِ دل لیکر مجھے کل اسکے کوچے میں
طبیعت بے قرار آئی، تمنا شرمسار آئی

نظر صیاد کی رنگِ قفس ہے میری آنکھوں میں
میں کیا جانوں خزاں آئی کہ گلشن میں بہار آئی

اُدھر خودداریاں دم بھر تمھیں مہلت نہیں دیتیں
اِدھر جانِ حزیں ہونٹوں پہ میرے بار بار آئی

ادب کل پاسِ محمل تک اسے جانے نہیں دیتا
ہوائے نجد مجنوں کا کہاں لیکر غبار آئی

نہ آنا دیکھ کر ان کا اجل کو شرم رکھنی تھی
ہمارے وقت پر آئی جو روزِ انتظار آئی

ملا وقتِ سحر کیا مجھ کو ٹھنڈی سانس بھرنے سے
ہوائے نکہتِ گل انکے گیسو کو سنوار آئی

نہ سمجھا جینے والوں نے نہ جانا مرنے والوں نے
نفس کیوں بار بار آئی اجل کیوں ایکبار آئی

نظر اس شکل میں لائی ہے تابِ جلوہ آرائی
اُدھر مستانہ وار اُٹھی اِدھر بیگانہ وار آئی

خمار آلود آنکھیں کھول دیں پھر پینے والوں نے
اذانِ صبح مسجد میکدے میں بھی پکار آئی

بڑی راحت تھی ہم کو جب تنِ موہوم خالی تھا
ہمیں بے چین کر دینے کو جانِ بیقرار آئی

ہماری بیخودی معیار ہے احساس کا کیفی
چمن میں جب خزاں آگئی سمجھیں گے بہار آئی

کیفی چریاکوٹی

ہندوستانی دواخانہ کی چند مشہور مفید دوائیں

مصفی

خون کی ہر قسم کی خرابی دور کرنے میں اکسیر ہے گرمی دانے، مہاسے، جھائیں، پھوڑے پھنسیاں، داد، چھاجن، برص، سوزاک، آتشک سب میں یکساں مفید ہے۔ صرف جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اسلئے حفظ ماتقدم کیلئے حالت تندرستی میں بھی استعمال کر سکتے اور بچوں کو بھی دے سکتے ہیں۔ ترکیب استعمال۔ ایک ایک خوراک تھوڑے پانی میں ملاکر صبح دوپہر اور شام پی جاتی ہے۔ قیمت ۳۶ خوراک ڈیڑھ روپیہ (ڈیڑھ روپیہ)

اکسیر سوزاک

نئے اور پرانے سوزاک میں کی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے۔ سوزش جلن اور پیپ کا آنا موقوف ہو جاتا ہے۔ پرانے سوزاک کے مریضوں کو اسکی ایک شیشی استعمال کرنیکے بعد مصفی ایک دو ہفتے استعمال کر لینی چاہیئے تاکہ اس مرض کی خطرناک زہریلے اثرات سے خون پاک صاف ہو جاوے اور پھر یہ موذی مرض عود نہ کرے۔ ترکیب استعمال ایک ایک کیپسول پانی کے گھونٹ سے صبح دوپہر اور شام کو نگل لیا کریں۔ قیمت ۴۸ کیپسول (۱؍۸)

اکسیر نسواں

رحم سے رطوبت آنے (لیکوریا) اور حیض کی بے قاعدگی میں نہایت مفید ہے۔ حمل نہ ٹھہرنا یا بار بار ساقط ہو جانا حیض کا درد سے آنا۔ کمر اور پنڈلیوں کا درد۔ رحم کا ضعف اور ورم ان سب شکایتوں میں حیرت انگیز نفع پہونچاتی ہے۔ ہسٹریا میں بھی مفید ہے۔ حاملہ کے لئے اس کا استعمال ممنوع ہے۔ قیمت فی شیشی بارہ آنہ (۱۲؍)

روغن موم

جدید کیمیاوی طریق سے بنایا گیا ہے خالص دیسی موم کا جوہر ہے جو سرد سے سرد موسم میں بھی نہیں جمتا اعصاب کو قوت دیتا ہے، درد، چوٹ لگنے جلنے اور موچ آنے میں نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ گٹھیا اور عرق النسا کے درد کو بھی تسکین دیتا ہے۔ قیمت ۸ تولہ کی شیشی دو روپیہ (۲؍)

شربت صدر

گردن توڑ بخار میں ڈاکٹری دوائیں ۲۵ فیصدی بھی کامیاب نہیں ہوتیں لیکن ہماری یہ دوا ۵۰ فیصدی سے زیادہ موثر ہے۔ ہر قسم کا نزلہ و زکام دور ہو جاتا ہے دق و سل میں بھی مفید ہے۔ منہ سے خون آنے کو روکتا ہے اور ہڈیوں کے بخار کو کھو دیتا ہے۔ دمہ کے صدہا مریض بھی اس کے استعمال سے اچھے ہوئے ہیں قیمت ۱۶ خوراک ایک روپیہ (۱؍)

دوار الشفاء

جنون (پاگل پن) کی دنیا میں پہلی اور آخری دوا ہے۔ لاکھوں دیوانے اسکے استعمال سے سیانے ہو چکے ہیں پاگل خانہ آباد کرنے کے سوا یورپ بھی آج تک اس مرض کی کوئی ممکن دوا پیش نہیں کر سکا آپ اپنے دیوانہ کو پاگل خانے بھیجنے سے پہلے ہمارے کارخانہ کی مایہ ناز دوا، دوار الشفاء استعمال کرائیے اور طب یونانی کا کرشمہ دیکھئے عورتوں کے مخصوص مرض (ہسٹریا) (اختناق الرحم) میں بھی نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ قیمت اسی قرص پانچ روپے (۵)

ملنے کا پتہ:- ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۴ دہلی